www.urducouncil.nic.in
مارچ 2017 قیمت: 10/- روپے

اردو آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان

ماہنامہ

خواتین کی دنیا

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

اردو دنیا

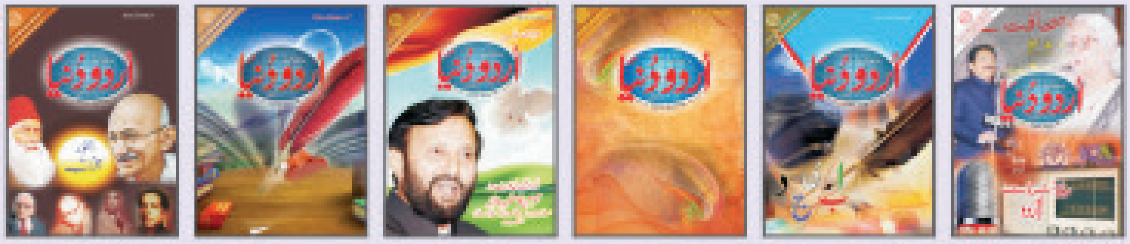

تمام تر رنگین صفحات اور دیدہ زیب تصاویر سے مزین ماہانہ عالمی جریدہ جسے آپ پوری دنیا میں اردو زبان کے کسی بھی ماہنامے سے بہتر پائیں گے۔ اردو کو آج کی دنیا سے جوڑنے والا اور عام اردو قاری و ادبی حلقوں کی دلچسپی کے ساتھ طلبا و اساتذہ کی ضرورتوں کا بھی خیال رکھنے والا اردو کا ماہنامہ

ہر شمارے میں پڑھیے ،اردو کے ادبی شاہکاروں کے علاوہ، علمی مضامین، ادبی انٹرویو، تاریخ، سائنس، صحافت، نئی کتابوں پر تبصرے، قومی اردو کونسل کی سرگرمیوں، سیمیناروں اور فروغ اردو سے متعلق نئی کاوشوں کا احوال اور بہت کچھ!

فی شمارہ: 15 روپے، سالانہ: 150 روپے

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

سہ ماہی فکر و تحقیق

قومی اردو کونسل کی منفرد پیش کش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظر عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

آج ہی اپنے نزدیکی بک اسٹال سے طلب کیجیے یا ہمیں لکھیے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی 110066 فون: 26109746 فیکس: 26108159

E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

آدھی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان

ماہنامہ

خواتین دنیا

جلد: 1 شمارہ: 1 مارچ 2017

آدھی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان

مدیر: پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

اعزازی مدیر: شعیب رضا فاطمی

نائب مدیر: ڈاکٹر عبدالحی

ناشر اور طابع:

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع: سلاسار امیجنگ سسٹمس C-7/5، لارنس روڈ انڈسٹریل ایریا، نئی دہلی۔ 110035

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت: -/10 روپے، سالانہ: -/100 روپے

صفحات: Total Pages 64

■ اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

● ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا

جسولہ، نئی دہلی۔110025، فون: 49539000

(شعبہ ادارت: 49539009)

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7

آر کے پورم، نئی دہلی۔110066

فون: 26109746، فیکس: 26108159

ای میل: sales@ncpul.in, ncpulsaleunit@gmail.com

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1، چھتہ بازار، حیدرآباد 500002

فون: 040 - 24415194

اس شمارے میں

4 اداریہ

مشعل — مدیر

5 روبرو

قرۃ العین حیدر سے انٹرویو — احمد ندیم قاسمی

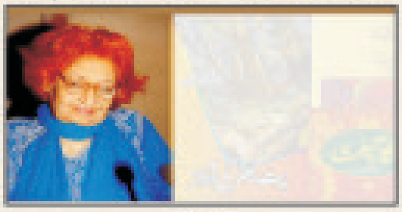

7 یوم خواتین

عالمی یوم خواتین

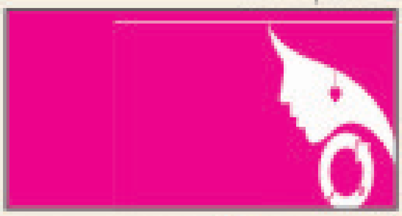

8 شخصیت

رقیہ سخاوت حسین — عذرا نقوی

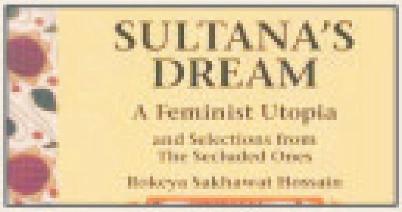

10 پرواز کے نئے آسمان

انوشہ انصاری — سعدیہ اقبال

13 نکہت سخن

خواتین کے منتخب اشعار

15 جہان نسواں

اردو صحافت اور خواتین — فرحت رضوی

اے روشنی فروش.......... — جویریہ قاضی

عورت کمزور نہیں — ہاجرہ بانو

28 آئین میں خواتین

تعزیرات ہند اور خواتین — خواجہ عبدالمنتقم

30 کہانیاں

ساحلوں کے اس طرف — ترنم ریاض

عمارت — نگار عظیم

کنول کے پھولوں والا تالاب — غزال ضیغم

قطار میں کھڑے چہرے — سلمیٰ صنم

52 حسن سخن

عزیز بانو داراب وفا، شائستہ یوسف، شبنم عشائی، ملکہ نسیم، نصرت مہدی، قمر سرور

58 باورچی خانہ

لذیذ پکوان، فرحت بخش مشروبات

60 زیبائش

چہرے اور جلد کی خوبصورتی

مشعل

اردو دنیا، فکر و تحقیق اور بچوں کی دنیا کے بعد قومی اردو کونسل کی ایک اور کوشش ماہنامہ خواتین دنیا!

آپ کے ذہن میں یہ سوال ابھر رہا ہوگا کہ آخر رسائل کی بھیڑ میں ایک اور رسالے کی ضرورت کیا ہے؟ خواتین کے رسائل تو پہلے بھی شائع ہوتے رہے ہیں اور آج بھی خواتین کے کچھ رسالوں کی اشاعت جاری ہے۔ 'تہذیب نسواں' (لاہور)، 'عصمت' (دہلی) وغیرہ وغیرہ ہیں جو نسائی طبقے کی نمائندگی کرتے رہے ہیں۔ ان رسائل نے نہ صرف عورتوں کی ذہنی بیداری میں اہم کردار ادا کیا ہے بلکہ انھی رسائل کی وجہ سے سماجی، سیاسی، تعلیمی اور تخلیقی سطح پر عورتیں متحرک ہوئی ہیں اور انھیں اپنے حقیقی مسائل کا ادراک بھی ہوا ہے تو ایسے میں خواتین دنیا کی اشاعت کا جواز کیا ہے؟

یہ سچ ہے کہ خواتین پر مرکوز رسالوں کی اشاعت ہوتی رہی ہے اور جرائد نسواں کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو ایک لمبی فہرست بھی تیار ہو جائے گی تاہم یہ حقیقت ہے کہ موجودہ عہد میں خواتین سے متعلق کوئی بھی ایسا رسالہ برصغیر سے شائع نہیں ہو رہا ہے جس میں نسائی وجود کے تمام معاشرتی، سماجی، سیاسی، اقتصادی، تعلیمی اور قانونی مسائل کا احاطہ کیا جاتا ہو۔ زیادہ تر نسائی رسائل خواتین کی شعری اور نثری تخلیقات تک ہی محدود ہیں۔ ان میں ایسا کوئی مواد نہیں جو عورتوں کے ذہنی وجود کو متحرک کر سکے، انھیں مرتعش کر سکے، انھیں اپنے حقیقی مسائل کا ادراک کرا سکے اور صنفی تفریق کے تعلق سے ان کی غلط فہمیوں کا ازالہ کر سکے، انھیں ان کی حقیقی منزلوں اور مقاصد سے روشناس کرا سکے۔ ایسی صورت میں خواتین سے متعلق ایک ایسے رسالے کی شدت سے ضرورت محسوس کی جا رہی تھی جس میں ایسے مسائل ہوں جو ہمارے نسائی ڈسکورس کا حصہ بن سکیں اور ان کے حوالے سے ایک نئے مکالمے کا آغاز ہو۔

اس حقیقت کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ تانیثیت کی تحریکوں کے باوجود آج بھی مابعد نوآبادیاتی معاشرے میں عورتوں کی اکثریت جبر و استحصال کا شکار ہے انھیں اپنے بنیادی حقوق تک حاصل نہیں ہیں حتیٰ کہ انھیں اپنی محنت کی اجرت تک نہیں ملتی۔ عورتوں کا ایک بڑا طبقہ آج بھی ایسا ہے جو تعلیم کے زیور سے محروم ہے۔ پدرسری نظام نے عورتوں کو ان تمام حقوق سے محروم کر دیا ہے جو انھیں ملنے چاہئیں تھے۔ صنفی تفریق کی ایسی دیوار کھڑی کر دی گئی ہے کہ مرد و عورت کے مابین ایک جنگ سی چھڑ گئی ہے۔ ایسی صورت میں ایک ایسا پلیٹ فارم ضروری ہے جس کے ذریعہ عورتوں سے جڑے ہوئے مسائل پر کھل کر گفتگو ہو۔ موجودہ منظر نامہ میں اس گفتگو کی اہمیت اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے کہ اب عورتوں کی مختاریت (Empowerment) بھی بحث کا موضوع بن چکی ہے اور اس تعلق سے مذاکرے اور سیمینار ہوتے رہتے ہیں۔ عالمی سطح پر یوم خواتین کا انعقاد بھی ان مسائل کی طرف ہماری توجہ مرکوز کراتا رہتا ہے۔ دیکھا جائے تو موجودہ عہد میں عورت اور مرد کے مابین ایک مثبت اور صحت مند مکالمے کی ضرورت زیادہ ہے۔ یہاں اس حقیقت کو بھی سامنے رکھا جانا چاہئے کہ ماضی میں عورتوں کو اپنے حقوق کے تئیں بیدار کرنے کا فریضہ مردوں نے ہی انجام دیا ہے۔ مولوی امتیاز علی 'تہذیب نسواں' جیسا رسالہ نہ شائع کرتے، راشد الخیری 'عصمت' رسالہ نہ نکالتے، ڈپٹی نذیر احمد بنات النعش، مراۃ العروس، توبۃ النصوح نہ لکھتے۔ خواجہ الطاف حسین حالی 'چپ کی داد' نہ تحریر کرتے تو شاید عورتوں میں بیداری کی لہر نہ پیدا ہوتی۔ بنیادی طور پر یہی مرد حضرات تھے جنھوں نے تانیثیت کا ایجنڈا اختیار کیا اور عورتوں کے مساوی حقوق کے لیے جنگ لڑی۔

'خواتین دنیا' کا مقصد صرف یہ ہے کہ سماجی، سیاسی، اقتصادی، تعلیمی تناظر میں خواتین کی صورت حال کا جائزہ لیا جائے اور خواتین کی ذہنی اور تخلیقی قوتوں کو مہمیز کیا جائے تاکہ وہ اپنے جذبات و احساسات کا کھل کر اظہار کر سکیں اور معاشرے کو اپنے مسائل کا ادراک کرا سکیں۔

مجھے بےحد خوشی ہو رہی ہے کہ 'خواتین دنیا' کی اشاعت کا آغاز عالمی یوم خواتین (8 مارچ) کے موقع پر ہو رہا ہے۔ اس کی مناسبت سے یہ رسالہ آدھی دنیا کے لیے بہتر خراج تحسین ہے۔

آپ کا

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

قرۃ العین حیدر سے مکالمہ

احمد ندیم قاسمی

——— رسالہ ''ادب لطیف'' نے ۱۹۳۶ء میں ''نقوش لطیف'' کے عنوان سے ایک افسانوی مجموعہ شائع کیا تھا جس کے مرتب احمد ندیم قاسمی تھے۔ یہ افسانوی مجموعہ اس لحاظ سے اہم تھا کہ اس میں اس عہد کی ۷ اخواتین افسانہ نگاروں کے افسانے ان کا مختصر تعارف اور ان کے ادبی نظریات سوال و جواب کی شکل میں شریک اشاعت تھے۔ آج ایک عرصہ گذر جانے کے بعد ان افسانہ نگاروں کے خیالات زیادہ اہمیت اختیار کر جاتے ہیں جن کا شمار کل مبتدی افسانہ نگاروں میں تھا، اب وہ ''جہانِ افسانہ کی سند'' بن چکی ہیں ———

(مرتب)

احمد ندیم قاسمی نے ''ابتدائیہ'' کے تحت جو کچھ لکھا ہے اس سے کتاب پر روشنی پڑتی ہے ——— چند جملے ملاحظہ ہوں:

''نقوش لطیف میں صرف نئی لکھنے والیوں ہی کو شامل نہیں کیا گیا۔ بلکہ یہ مجموعہ اس دور کی تقریباً تمام زندہ خواتین کی نمائندگی کرتا ہے۔''

''قرۃ العین حیدر کی انفرادیت اس درجہ نمایاں ہے کہ بوڑھوں طبقے کو ابھی مدتوں تک کوئی ان سے بہتر نمائندہ شاید ہی مل سکے۔ ———''

''میں افسانہ نگاروں کی بھرپور نمائندگی کے علاوہ فنکاروں کے فنی نظریات بھی پیش کرنا چاہتا تھا اور میں مسرور ہوں کہ میرا مرتب کردہ سوال نامہ جو مندرجہ ذیل آٹھ استفسارات پر مشتمل تھا، ایک گراں بہا تنقیدی ذخیرے کی بنیاد ثابت ہوا۔ یہاں صرف ان جوابات کو شامل کیا جا رہا ہے۔ جو قرۃ العین حیدر نے احمد ندیم قاسمی کو دیے تھے۔ ان جوابات سے قرۃ العین حیدر کے فکر اور فن کی بدلتی ہوئی کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

س۔ آپ ادب برائے ادب کی قائل ہیں یا ادب برائے زندگی کی؟

ج۔ میرے نزدیک ادب برائے زندگی کا نظریہ بہتر ہے، لیکن اس حد تک نہیں کہ ادب محض پروپیگنڈا بن کر رہ جائے۔ زندگی کتنی ہی بیمار اور حقیقتیں کیسی ہی غلیظ اور تلخ کام سہی، لیکن تصویر کے روشن اور خوشگوار رخ کو نظر انداز کر کے صحت مند ادب کسی طرح سے پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ رومان کو فراری ادب ماننے سے مجھے انکار ہے، فنکار کا کینوس ''قومی جنگ'' اور ''سرخ سویرا'' کی حدود سے زیادہ وسیع ہوتا ہے۔

س۔ اردو ادب میں ترقی پسند تحریک کے متعلق آپ کے خیالات کیا ہیں؟

ج۔ میں اردو ادب میں ترقی پسند تحریک کی حامی ہوں، زندگی ایک نئے موڑ پر آ چکی ہے، انسانیت ایک عالمگیر انقلاب سے ہمکنار ہو رہی ہے، دنیا ایک نئے پیغام کی منتظر ہے اور اس TRANSITIONAL اور تجرباتی دور میں وہی ادب ہمارے لئے صحت مند، تعمیری اور POSITIVE ثابت ہو سکتا ہے، جو زندگی کے اس بدلتے ہوئے دھارے، اس تیز بہاؤ کا ساتھ دے اور جو زندگی کی صحیح تنقید ہو، ایک نئی اور بہتر دنیا کا پیغام ترقی پسند ادب کا پیغام ہے، یاسیت اور قنوطیت کے لئے اس میں کوئی جگہ نہیں، ادب کی افادیت اور واقعیت ایک ہی قسم کے (STEREO TYPED) نظریوں کی نمائندگی اور CYNICAL NOTE پر منحصر نہیں جو ہمارے ترقی پسند ادب کے زیادہ حصہ میں پایا جاتا ہے، کہیں نہ کہیں سے مارکس، اینگلز یا فرائیڈ کو افسانے میں گھسیٹ

لانے سے افسانہ لازمی طور پر ترقی پسند نہیں بن جاتا، زندگی کا بہاؤ ایک مقررہ اور طے شدہ حدِ فاصل سے نہیں روکا جاسکتا، میں جمالیات کو حقیقت پسندی کے منافی اور داخلیت پرستی پر مبنی نہیں سمجھتی، افادیت اور جمالیات کی، زندگی سے ہم آہنگی ہی صحیح ترقی پسندی ہے۔

س۔ جدید اردو افسانہ نگاری میں جنسی تجزیہ کی رو کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

ج-جدید اردو افسانے میں جنسی تجزیہ کی رو کی میں مخالف نہیں ہوں، اگر ہمیں زندگی کی صحیح عکاسی اور نمائندگی کرنی ہے تو ہم اپنی تخلیقات میں جنسیات کو نظر انداز نہیں کرسکتے، عصمت، ممتاز مفتی اور منٹو کے بغیر ہمارے جدید ادب کا کینوس مکمل نہیں ہوسکتا تھا۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو ڈی ایچ لارنس کا نام سن کر بھویں چڑھا لیتے ہیں، اگر جنسی مسائل کو صحت مندی کے ساتھ پیش کیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس رجحان کے علمبرداروں کو گردن زدنی قرار دیں، لیکن آج کل ہمارے بیشتر ادبا، جس بے رحمی سے اس رجحان کو بغیر کسی مقصد کے محض تفریحاً EXPLOIT کر رہے ہیں، میں اس کے خلاف ہوں SEX IS LIFE! محض تین کا خیال ہے، لیکن میں جنس کو اس قدر لامحدود نہیں سمجھتی، زندگی وسعتوں کو اتنا محدود نہیں کیا جاسکتا کہ انسان ان ذہنی پیچیدگیوں سے آگے بڑھ ہی نہ سکے، ہمارے افسانہ نگار جنسیات کو جس قدر گمراہ اور بے ترتیب (PERVERTED) انداز سے پیش کر رہے ہیں، اسے دیکھ کر ایک نوع کی کراہت سی محسوس ہوتی ہے اور یقین نہیں آسکتا کہ زندگی اتنی بیمار اور غلیظ ہے۔

س۔آپ افسانے میں پلاٹ کو ضروری سمجھتی ہیں یا کردار نگاری کو، یا دونوں کو؟

ج-میں افسانہ کی تکنیک میں پلاٹ پر کردار نگاری اور خیالات و تاثرات کے خوبصورت اظہار کو ترجیح دیتی ہوں میں نے پلاٹ کی تعمیر کی طرف اب تک توجہ نہیں کی اس لئے میرا خیال ہے کہ، میں ناول کامیابی سے کبھی نہ لکھ سکوں گی۔

س۔ آپ کے فن پر غیر ارادتاً کس افسانہ نگار کی زبان اور بیان اثر انداز ہوئے ہیں؟

ج۔میں نہیں کہہ سکتی کہ کسی خاص افسانہ نگار کا طرزِ بیان میرے اسلوب پر اثر انداز ہوا ہے یا نہیں، کرشن چندر میرا پسندیدہ فنکار ہے۔ میں اس کے اسٹائل سے بہت متاثر ہوں، ممکن ہے کہ غیر ارادتاً میں نے کہیں اس کا طرز اختیار کرنے کی کوشش کی ہو۔

س۔ اپنے فن کا موجودہ اسلوب اپنانے میں آپ نے ارادتاً کیا کیا کوششیں کیں؟

ج-اپنا موجودہ طرز نگارش اپنانے میں میں نے ارادتاً قطعی کوئی کوشش نہیں کی، شروع میں مجھے اپنی تحریروں کی طرف سے کبھی اچھی طرح سے اطمینان نہ ہوتا تھا، لیکن جب مجھ سے کہا گیا کہ مجھے افسانہ نگاری کا شوق چھوڑ نا نہیں چاہئے تو گذشتہ برس میں نے چند افسانے لکھے۔ کسی خاص ادیب کا اسلوب میرے پیش نظر نہیں تھا، میں رسالے بہت کم پڑھتی ہوں اور کرشن چندر، عصمت چغتائی وغیرہ اپنے چند پسندیدہ ادیبوں کی تصانیف کے علاوہ اردو کی زیادہ کتابیں پڑھنے کا اتفاق بھی نہیں ہوا، دراصل افسانہ نگاری میرے نزدیک ایک بہت ہی فضول مشغلے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی، جب کورس کی کتابوں یا تفریحی مشاغل سے اکتانے لگتی ہوں تو افسانے لکھنا شروع کردیتی ہوں اور ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ افسانے کے اختتام تک پہنچتے پہنچتے اس قدر "بوریت" چھلکتی ہے کہ اسے مدتوں کے لئے ادھورا چھوڑنا پڑ جاتا ہے اور یہ احساس ہوتا ہے کہ اس سے زیادہ فضول افسانہ آج تک نہیں لکھا گیا ہوگا۔

س۔ اپنے فن کے بارے میں آپ نے مستقبل کے لئے کیا پروگرام سوچ رکھا ہے؟

ج-اپنے فن (کس قدر گرینڈ لفظ ہے) کے بارے میں تو میں نے اس وقت تک کچھ نہیں سوچا، بہت ممکن ہے کہ افسانہ نگاری کے مشغلے سے بہت جلد طبیعت اکتا جائے مجھے انگریزی میں لکھنا زیادہ اچھا لگتا ہے۔ کبھی کبھی جی چاہتا ہے کہ انگریزی جرنلزم کو CAREER بنانے کی کوشش کی جائے لیکن یہ خیال خاصا FANTASTIC سا ہے اور پھر اس ہندوستان میں! جہاں وحیدہ عزیز کے متعلق لکھا جاتا ہے کہ یہ خاتون تو ہو ہی نہیں سکتیں، قطعی کوئی مرد ہے، جو نسوانی نام سے اتنے عمدہ مضامین لکھتا ہے۔

س۔کیا آپ ناول لکھنے کا ارادہ رکھتی ہیں؟

ج۔ناول لکھنے کا اب تک تو کوئی ارادہ نہیں ہوا۔ کیوں کہ میں جانتی ہوں کہ جب ایک افسانہ ختم کرنا مصیبت ہو جاتا ہے، تو ناول اس رفتار سے برسوں میں بھی مکمل نہ ہو سکے گا۔ (سرخ آنچل، ۱۹۴۶ء) ■

عالمی یوم خواتین

-ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی-

8 مارچ عالمی یوم خواتین کے طور پر اس برس بھی عالمی سطح پر منایا گیا۔ اس برس کا تھیم تھا تبدیلی کے لیے بہادر بنیں (be bold for change)۔ یہ ایک بے حد اور پرکشش عنوان ہے۔ اس عنوان کے بطن سے حوصلے کی جو کرن پھوٹتی ہے اس کے ذریعہ خواتین کی اندھیری دنیا کو روشنی کی سوغات فراہم کی جا سکتی ہے۔ ہم اگر صرف اپنے معاشرے کا جائزہ لیں تو اندازہ ہوگا کہ ہمارے آس پاس جن مسائل کا پہاڑ کھڑا ہے ان میں بیشتر وہ مسائل ہیں جو خواتین سے شروع ہوتے ہیں اور انھیں پر ختم بھی ہو جاتے ہیں۔ ''تعلیم'' ان مسائل کی ایک مثال ہے۔ کون نہیں جانتا کہ زیور تعلیم سے آراستہ خواتین گھر کو جنت بنا سکتی ہیں، بچوں کی بہتر نگہداشت کر سکتی ہیں۔ انھیں سماج میں بہتر شہری بننے کے گر سکھا سکتی ہیں۔ مذہبی، اخلاقی و معاشی طور پر خود کفیل بنانے کے لیے عورت سے بہتر کوئی معلم نہیں۔ لیکن ہماری حالت یہ ہے کہ چراغ تلے اندھیرا کے مصداق سب کچھ جانتے اور سمجھتے ہوئے بھی ہم نے نصف بہتر کو بدترین مخلوق قرار دے رکھا ہے۔

8 مارچ کا تعلق اسی بھولے ہوئے سبق کو از سر نو یاد کرنے سے ہے۔ 8 مارچ عالمی یوم خواتین کے طور پر صرف اس لیے نہیں منایا جاتا کہ ہم اسے محض سالانہ تقریب کی حد تک محدود رکھیں اور برس کے 365 دنوں میں سے ایک دن تو یوم خواتین کے طور پر منائیں لیکن باقی کے 364 دن پر اس ایک دن کا سایہ بھی نہ پڑے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمارے ملک میں ابتدا سے اب تک خواتین کا ایک بڑا طبقہ ہر طرح کے ناسازگار ماحول سے نبرد آزما ہوتے ہوئے علم و عمل کے میدان میں نہایت عزم و استقلال سے کھڑا ہے۔ ادب ہو یا صحافت، سائنس ہو یا ٹکنالوجی خلابازی ہو یا بحری سفر، جنگ ہو یا امن ہر میدان میں خواتین نے اپنے وجود کو ثابت کیا ہے۔ ضرورت ہے کہ ہم معاشرے کے مستقبل کو تابناک بنانے کے لیے خواتین کی موجودہ نسل کو مزید باوقار بننے کے مواقع فراہم کریں۔ صبر و ضبط کی پیکر اللہ کی اس سب سے بہترین مخلوق کے حقوق کو غصب کرنے سے جو نقصانات ہم بھگت رہے ہیں اس سے برأت کا بس ایک طریقہ ہے کہ ہم اپنے معاشرے میں خواتین کے لیے عزت و احترام کے ماحول کو مستحکم کریں۔ خود خواتین کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی تمام تر ذمہ داریوں کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ اپنے اپنے گھروں، اس کے آس پاس، کالج اور اسکول میں، آفس میں بہتر تبدیلی کے لیے بہادری کا ثبوت دیں اور خود کو اپنے معاشرے کی تبدیلی کا اہل ثابت کریں۔ (ادارہ)

شخصیت

عذرا نقوی

حقوق نسواں کی علم بردار
رقیہ سخاوت حسین

آج تاریخ کے صفحات سے نکال کر برصغیر کی ایک ایسی باہمت خاتون رقیہ سخاوت حسین سے آپ کی ملاقات کرا رہی ہوں جس نے ایک صدی پہلے اپنے قلم اور عمل سے حقوق نسواں اور مسلمان عورتوں کی تعلیم کے لئے بہت کچھ کیا۔ انھوں نے کلکتہ میں مسلمان لڑکیوں کے لئے ایک اسکول قائم کیا تھا جو اب تک رقیہ سخاوت حسین میموریل گرلز کالج کے نام سے قائم ہے۔ رقیہ خاتون جو شادی کے بعد بیگم رقیہ سخاوت حسین کے نام سے مشہور ہوئیں 1880 میں بنگال کے ایک زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئیں، ان کے والد ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ زمیندار تھے۔ زمانے کے رواج کے مطابق انھوں نے اپنے بیٹے کو تو اعلیٰ تعلیم دلائی اور کئی زبانیں سکھائیں لیکن لڑکیوں کی تعلیم صرف گھر تک محدود تھی۔ بنگال کے اعلیٰ طبقے کے مسلمان گھرانوں میں اس زمانے میں عورتوں کو بنگالی زبان نہیں پڑھائی جاتی تھی بس گھر پر عربی اور فارسی پڑھانے کا رواج تھا۔ رقیہ کی بڑی بہن کریم النسا جو کم عمری ہی سے پڑھنے اور شاعری کا شوق رکھتی تھیں انھیں اس پاداش پر کہ وہ ایک بنگالی نظم پڑھ رہی تھیں کئی برس خاندان کی ایک بزرگ خاتون رشتہ دار کے گھر تقریباً قید کر دیا گیا تھا، ان کی عمر اس وقت صرف بارہ سال تھی۔ رقیہ سخاوت حسین نے اپنے خاندان کے حالات لکھتے ہوئے اپنی خود نوشت میں لکھا تھا کہ اس زمانے کے اشرافیہ کے رواج کے مطابق لڑکیاں نہ صرف سخت پردے میں "زنانے" میں رہتی تھیں بلکہ غیر برادری کی عورتوں سے بھی پردہ کرتی تھیں۔ قریبی رشتہ دار خواتین، معتبر خاندانی خادماؤں، کے علاوہ کنواری لڑکیوں کو کسی کے سامنے جانے کی اجازت نہیں تھی۔

رقیہ خاتون اور کریم النسا کے اعلیٰ تعلیم یافتہ بڑے بھائی بہت درمند دل رکھتے تھے، اور اپنی بہنوں کا شوق دیکھ رہے تھے لیکن خاندان اور سماج کی روایات کے خلاف نہیں جا سکتے تھے اس لئے انھوں نے دونوں بہنوں کو گھر میں چھپ چھپ کر رات کو لالٹین کی روشنی میں تھوڑی بہت بنگالی اور انگریزی پڑھائی۔ کریم النسا کی شادی چودہ سال کی عمر میں کر دی گئی تھی اور بعد میں انھوں نے شاعرہ کے طور پر شہرت پائی۔

رقیہ خاتون کی شادی 1896 میں سولہ سال کی عمر میں خان بہادر سخاوت حسین سے ہوگئی جو اعلیٰ تعلیم یافتہ، ولایت پلٹ تھے اور بھاگلپور (بہار) کے ڈپٹی مجسٹریٹ تھے، ان کی پہلی بیوی کا انتقال ہو گیا تھا۔ عمر میں وہ رقیہ سے بہت بڑے تھے لیکن یہ شادی رقیہ کے لئے نیک فال ثابت ہوئی۔ حالانکہ سید سخاوت حسین کی مادری زبان اردو تھی لیکن انھوں نے رقیہ کی نہ صرف بنگالی زبان میں لکھنے میں ہمت افزائی کی بلکہ انگریزی پڑھنے کا بھی انتظام کروا دیا۔ رقیہ کی جوانی کا بڑا حصہ صوبۂ بہار میں گذرا جہاں انھیں اپنے شوہر کی اعلیٰ سماجی حیثیت کی وجہ سے بہت سی ہندو اور انگریز تعلیم یافتہ خواتین سے ملاقات کا بھی موقع ملا، انگریزی ادب کے مطالعے نے انھیں ایک نئی دنیا کی جھلک دکھائی۔ اپنے شوہر کی ہمت افزائی کی وجہ سے اب رقیہ نے انگریزی میں بھی لکھنا شروع کر دیا۔ انھوں نے متعدد کہانیاں مضامین اور ناول لکھے جو عورتوں سے ہی متعلق تھے۔ وہ بنیادی طور پر سماجی کارکن تھیں اس لئے ادب کو پس پشت ڈال کر شادی کے چند ہی سال بعد رقیہ حقوق نسواں اور عورتوں کی تعلیم کی زبردست علم بردار بن گئیں۔

شادی کے صرف تیرہ سال بعد سخاوت حسین کا انتقال ہو گیا۔ انھوں نے اپنی وصیت میں رقیہ کے لئے کافی رقم چھوڑی تھی تاکہ وہ مسلمان لڑکیوں کے لئے تعلیم کو آگے بڑھائیں۔ لہٰذا رقیہ نے اپنے گھر میں لڑکیوں کے لئے ایک اسکول کھول لیا۔ لیکن یہ کام اتنا آسان نہ تھا، ان کی سوتیلی بیٹی اور داماد نے گھر پر قبضہ جمانے کے لئے رقیہ کو دھکے مار کر گھر سے باہر نکال دیا۔ انھوں نے اپنا مختصر اثاثہ اور کتابیں جمع کیں اور

کلکتہ کا رخ کیا۔ وہاں انھوں نے 1911 میں سخاوت حسین میموریل گرلز اسکول قائم کیا۔ 1916 میں ایک انجمن خواتین کی بنیاد ڈالی جو خواتین کی کانفرنسیں، مباحث وغیرہ منعقد کرتی تھی۔ ان کے اسکول سے امیر اور متوسط طبقے کی لڑکیاں مستفید ہوتی تھیں مگر انجمن کے ذریعے انھوں نے غریب عورتوں کے لئے بھی بہت کام کیا۔ گھر گھر جا کر انھوں نے خواتین کو انجمن کا ممبر بنایا۔ یہ انجمن غریب بیواؤں کی مالی امداد کرتی تھی، پریشان حال اور مظلوم بیویوں کو تحفظ اور پناہ دیتی تھی، غریب لڑکیوں کی شادیاں کراتی تھی اور سب سے اہم بات یہ کہ غریب طبقے کی لڑکیوں کے لئے بھی تعلیم کا انتظام کرتی تھی۔ انھوں نے دوسری خواتین کے ساتھ ٹیم بنا کر کلکتہ کی کچی بستیوں میں ہندو اور مسلمان عورتوں کے لئے غیر معمولی تعلیم اور حفظان صحت کی تربیت کا انتظام کیا تھا۔ تعلیم بنگالی اور اردو میں دی جاتی تھی۔

انھوں نے انگریزی میں ایک کہانی لکھی ''سلطانہ کا خواب'' جس نے بہت شہرت پائی اور جس پر تنقید اور تعریف کا طوفان آ گیا۔ یہ دلچسپ کہانی پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ایک صدی پہلے اس خاتون نے بالکل نئے انداز کی کہانی تخلیق کی تھی جو اس زمانے کے ادب سے بالکل الگ تھی۔ یہ سائنس فکشن بھی کہلائی جا سکتی ہے اور فنتاسی fantasy بھی۔ اس میں ایک لڑکی سلطانہ کو خواب میں اس کی دوست سارہ ایک ایسی مملکت میں لے جاتی ہے جہاں عورت ہی ملکہ ہے، جہاں مرد عورتوں کی طرح پردے میں بٹھا دیے گئے ہیں اور کاروبار جہاں بہت امن چین سے عورتیں چلا رہی ہیں، جہاں عورتوں کی دو یونیورسٹیاں ہیں اور عورتوں کی سائنسی تجربہ گاہیں ہیں، جہاں لڑکیوں کے بہت سے اسکول ہیں، کم عمری کی شادیاں ممنوع ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ حیرت ہوتی ہے کہ اس زمانے میں رقیہ نے کہانی میں سائنسی فکشن کے انداز پر مستقبل میں ہونے والی ایجادات کا تذکرہ کیا ہے۔ جیسے سلطانہ کی دوست اس کو اپنے گھر کے باورچی خانے میں لے جاتی ہے، ان کے اندر جانے سے پہلے پردہ نشین مردوں کو ہٹا دیا جاتا ہے۔ یہ باورچی خانہ خوبصورت کچن گارڈن کے درمیان بنا ہے، نہ دھواں ہے نہ لکڑی کا چولہا، کھڑکیوں میں پھول سجے ہیں۔ سلطانہ کے استفسار پر اس کی دوست اسے شمسی توانائی سے بنا چولہا دکھاتی ہے جہاں سورج کی روشنی ایک پائپ کے ذریعہ جمع کی جاتی ہے اور اس پر کھانا پکتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کہانی میں ایک اور ایسی ہی سائنسی ایجاد کا بھی تذکرہ ہے جو ضرورت پڑنے پر بادلوں کے پار جا کر بارش روک دیتی ہے۔ یہ کہانی اپنے وقت کے حساب سے بہت آگے کی بات کر رہی تھی، اس زمانے میں پارسی، عیسائی اور ہندو عورتوں کی تعلیم کی تحریکوں میں بھی عورتوں کے لئے سائنس اور حساب کی تعلیم نصاب میں شامل نہیں کی جاتی تھی۔

انھوں نے بہت سے مضامین لکھے جس میں سے ''عزلت نشین'' کافی مشہور ہوا۔ ان کے پہلے اور آخری ناول کا نام ''پدم راگ'' تھا جو 1925 میں شائع ہوا تھا، جس میں ایک دارالامان میں رہنے والی مختلف عورتوں کی زندگی کی جھلکیاں ہیں یہ ناول کچھ حقیقت اور کچھ خواب کی سی کیفیت لئے ہوئے تھا جب کہ ''سلطانہ کا خواب'' پورا خواب کی کیفیت تھا۔ ''پدم راگ'' میں دارالامان کی سربراہ خاتون زینب کا نکاح ایک بہت پڑھے لکھے مرد سے ہوا تھا مگر رشتہ داروں کی ریشہ دوانیوں اور غلط فہمیوں کی وجہ سے رخصتی نہیں ہو پائی اور اس کے شوہر نے دوسری شادی کر لی۔ زینب بہت ہمت اور اعتماد سے، اپنے بھائی کی مدد سے، پاکبازی اور عزت سے ایک کارآمد زندگی گذارتی ہے، شاعری کرتی ہے، بھائی کی جائداد کا کام سنبھالتی ہے اور دارالامان چلاتی ہے۔ ناول کے اختتام میں صورت حالات بدل جاتی ہے اور اس کے شوہر سے اس کی پھر ملاقات ہوتی ہے اور وہ اس سے واپسی کی درخواست کرتا ہے۔ لیکن وہ کہتی ہے ''میں اپنی زندگی کا ہدف پہلے طے کر چکی ہوں، گرہستی کی زندگی گذارنا خدا نے میرے نصیب میں نہیں لکھا تھا، تم اپنے رستے جاؤ، میں اپنی راہ جاؤں گی۔'' اس زمانے کو دیکھتے ہوئے ناول کا یہ بہت مختلف قسم کا انجام تھا، بلکہ آج بھی خواتین کے ناولوں میں روایتی قسم کے اختتام ہی لکھے جاتے ہیں۔

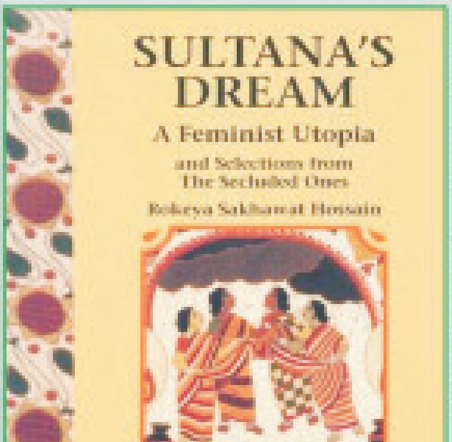

بیگم رقیہ سخاوت حسین جیسی اور بھی بہت سی خواتین تاریخ کے صفحات میں زندہ ہیں، جنھوں نے مسلم خواتین کی تعلیم اور حقوق کے لئے اپنی خاندانی پابندیوں، روایتوں اور مجبوریوں کے باوجود آنے والی نسلوں کے لئے راہیں ہموار کیں۔ ان کے ساتھ ہی ان مردوں کے نام بھی آتے ہیں جو ان کے مددگار تھے، ان کی ہمت افزائی کرتے تھے۔ لازم ہے کہ ایسے خواتین اور حضرات کی یادگا ہے گاہے تازہ کر لی جائے۔ ▫

انوشہ انصاری

خلائی اسٹیشن تک پہنچنے والی پہلی مسلمان سیاح

سعدیہ اقبال

انوشہ انصاری ان لوگوں میں ہیں جو صرف خواب دیکھنے پر نہیں بلکہ اسے شرمندۂ تعبیر کرنے پر یقین رکھتی ہیں۔ خواب بڑے ہوں تو پرواز بھی فطری طور پر بلند ہو جاتی ہے۔ انوشہ نے صرف زمینی خوابوں کو حقیقت کا رنگ نہیں دیا بلکہ خلاء کے خواب کو بھی اپنے جنون اور جذبہ کے ذریعہ پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا اور ایسی تاریخ رقم کی جو واقعی بہت مشکل ہے لیکن انہوں نے یہ ثابت کر دیا کہ اگر عورت اپنے مقصد کو لے کر محنت اور کوشش کرے تو کوئی کام ناممکن نہیں ہے۔

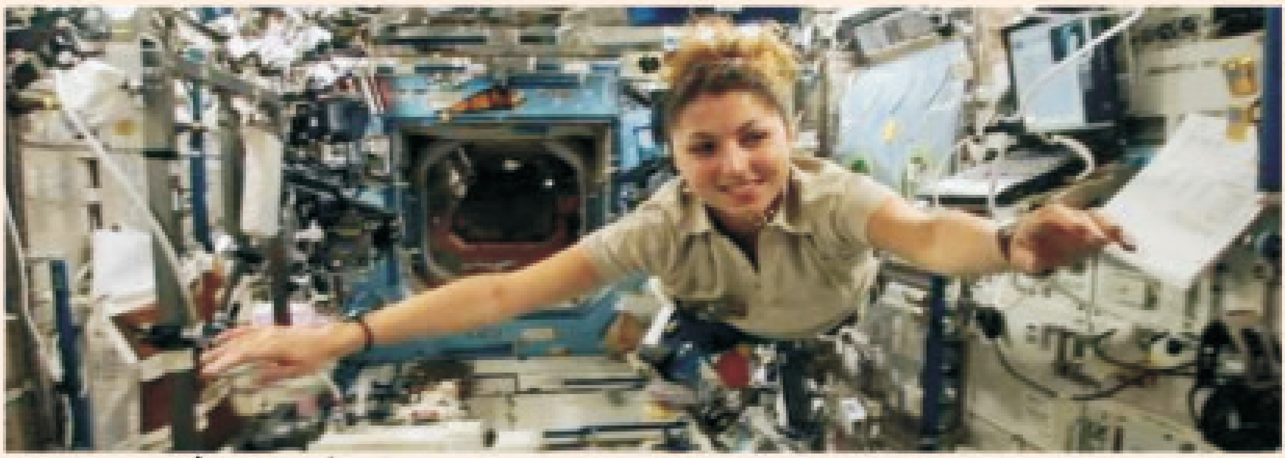

تجارت کی دنیا میں پورے وثوق کے ساتھ قدم رکھنے والی ایران نژاد امریکی انوشہ انصاری یکے بعد دیگرے کامیابیوں کا زینہ طے کرتے ہوئے اس بلندی پر پہنچیں کہ لوگوں کے لیے ایک مثال بن گئیں۔ ان کامیابیوں نے انوشہ کے حوصلے اور بھی بلند کر دیے پھر تو انہوں نے خلاء میں سفر کرنے کی ٹھان لی اور اسے اپنا مقصد بنا لیا۔ وہ 2006ء میں خلائی اسٹیشن تک پہنچنے والی پہلی پرائیویٹ مسلمان سیاح ہیں۔ اس سے قبل بطور سیاح صرف تین پرائیویٹ افراد نے ہی خلا کا سفر کیا تھا۔ وہ خلاء میں سیاحت کی غرض سے سفر کرنے والی دنیا کی پہلی خاتون قرار پائیں۔ یوں تو خلائی سیاحوں کی فہرست میں صرف سات افراد ہیں اور خلانوردی کے لیے انوشہ انصاری پہلی اور اب تک کی واحد خاتون ہیں۔ اگر عام طور پر خلانوردی کرنے والے مسلمانوں کی فہرست کا جائزہ لیا جائے تو اس میں بھی یہ اکلوتی خاتون ہیں۔

انوشہ انصاری 12 ستمبر 1966ء کو مشہد (ایران) میں پیدا ہوئیں۔ ان کی مادری زبان فارسی ہے۔ ان کا خاندان ان کے بچپن میں ہی امریکہ میں جا بسا تھا۔ انہیں انگریزی اور فرانسیسی زبان پر دسترس حاصل ہے اور روسی زبان سے متعلق بھی کافی معلومات ہے۔ انہوں نے جارج واشنگٹن یونیورسٹی سے کمپیوٹر سائنس اور الیکٹریکل انجینئرنگ میں بیچلر کی ڈگری حاصل کی۔ گریجویشن کے فوراً بعد انہوں نے MCI میں کام کرنا شروع کیا یہیں ان کی ملاقات ان کے ہونے والے شوہر حامد انصاری سے ہوئی جو 1991ء میں رشتۂ ازدواج میں بدل گئی۔

1993 کا دور تجارت کے لیے اتھل پتھل کا دور کہا جاتا ہے۔

اس کے باوجود انوشہ انصاری نے اپنے شوہر حامد انصاری اور دیور عامر انصاری کو ذہنی طور پر تیار کیا کہ وہ ٹیلی کام ٹیکنالوجی کمپنی میں اپنا پیسہ لگائیں اور وہ اس میں کامیاب ہوئیں۔ ان کی سافٹ سوئچ ٹکنالوجی نے ٹیلی کام سروسز کو مزید بہتر بنانے میں اہم رول ادا کیا۔ اسی طرز کی ایک کمپنی سونس نیٹ ورک کے (Sonus network) نے 2001 میں ان کی کمپنی کے 10.8 ملین شیئرز کو لینے کی بات کی جس پر انصاری فیملی تیار ہوگئی پھر سونس نیٹ ورک اسے خرید لیا۔ انوشہ انصاری سونس کی وائس پریسڈنٹ اور جنرل منیجر آف سونس بنائی گئیں۔ وہ سونس کمپنی میں دوبارہ اسی پوزیشن پر آگئیں۔ بزنس کی دنیا میں بھی یہ جوڑا انتہائی کامیاب رہا۔ ایک اچھی بیوی کے علاوہ ایک بہترین انتظامی آفیسر کے طور پر بھی انوشہ نے اپنے شوہر کا ساتھ دیا۔ تجارت کی دنیا میں عظیم کامیابی نے ہی انوشہ کے خلائی سفر کے خواب کو مزید مہمیز لگائی۔ انہوں نے خلا میں سفر کرنے کے لیے تقریباً 20 ملین ڈالر کی خطیر رقم خرچ کی۔ انوشہ نے خلا میں سفر کرنے سے پہلے روس کے ایک تربیتی مرکز میں جا کر نہ صرف نقل و حرکت کی تربیت حاصل کی بلکہ اسپیس ایڈونچر لمیٹیڈ کے تعاون سے خلا بازی کی بھی ٹریننگ لی۔ 21 اگست 2006 کو خلاء کی سیاحت کے لیے ایک جاپانی تاجر (Daisuke Emonoto) اپنی صحت کی خرابی کے سبب خلائی سفر سے روک دیے گئے، پھر کیا تھا انوشہ کو یہ سنہرہ موقع ہاتھ آگیا۔ انوشہ اس جاپانی تاجر کی جگہ جانے کے لیے منتخب کرلی گئیں۔ بقول انوشہ ان کے خلائی سفر کا مقصد خلانوردی کے لیے ذاتی سرمایہ کاری کے امکان کی تشہیر کرنا بھی ہے۔

انوشہ انصاری 18 ستمبر 2006 کو قزاخستان کے خلائی مرکز بیکانور سے روسی ساختہ خلائی راکٹ ''سویوز'' (Soyuz) میں روانہ ہوئیں اور یوں انوشہ نے پہلی مسلمان خاتون سیاح کی حیثیت سے بین الاقوامی خلائی اسٹیشن پر قدم رکھا۔ روس کے میخائل ترن (Mikhail Tyurin) اور امریکہ کے خلا باز مائیکل لوپز (Michael lopez) بھی اس سفر میں ان کے ساتھ تھے۔ اسپیس ڈاٹ کام نے انوشہ کا انٹرویو لیتے ہوئے پوچھا کہ انوشہ آپ کو اپنے خلانوردی سے کیا حاصل کرنے کی امید ہے۔ انوشہ نے جواب دیا کہ مجھے امید ہے کہ میں تمام دنیا کی نوجوان نسل خاص طور پر خواتین اور لڑکیوں اور مشرق وسطیٰ کے تمام ممالک کی خواتین کی ہمت افزائی کا سبب اور طاقت بن سکتی ہوں۔

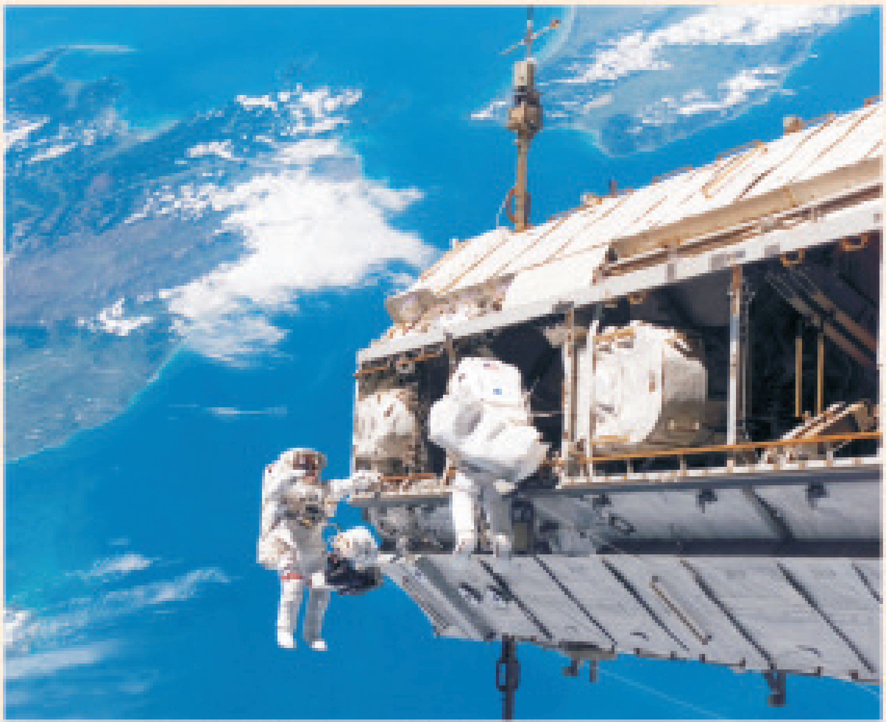

انوشہ کے خلا میں جانے سے قبل ان کی ڈریس جو کہ امریکی جھنڈے کی نمائندگی کرتی ان کی خواہش تھی کہ وہ ایرانی جھنڈے کو بھی اس میں ایک جگہ دیں، اسے امریکی میڈیا نے بڑھا چڑھا کر غلط طریقے سے بیان کیا۔ انوشہ ایک وسیع النظر خاتون ہیں ان کے دماغ میں ایسی تنگ نظری آ بھی نہیں سکتی۔ چونکہ ان کو اپنے وطن ایران سے محبت تھی جس کا اظہار انہوں نے کیا تھا۔ اور وہ ایران کے انقلاب سے پہلے والے ایرانی جھنڈے کو پہننا چاہتی تھیں لیکن ناسا اور روسی افسران کے کہنے پر انہوں نے ایرانی جھنڈا انہیں پہنا لیکن انہوں نے ایرانی پرچم کے رنگ کی ڈریس پہنی اور ایرانی پرچم کو اپنے آفیشل فلائٹ پیچ کے طور پر رکھا۔ انوشہ اور ان کے شوہر نے وضاحت کی کہ یہ کوئی سیاسی پیغام نہیں تھا بلکہ امریکہ اور ایران کے رشتہ میں آئی تلخی کو کم کرنا مقصود تھا۔ انوشہ اس خبر کے تعلق سے پوری دنیا میں سرخیوں میں رہیں۔ ایران میں بھی انوشہ کی خلانوردی کو

لے کر کچھ لوگوں نے مخالفت کی تو کچھ لوگوں نے فخر محسوس کیا۔ انوشہ کی لانچنگ کے وقت سے واپس آنے تک ایران کے میڈیا نے ان کے انٹرویو اور لائیو پروگرام دکھائے۔ ایران کے اخبار ہم بستگی اور روزنامہ 'جام جم' میں ان کی سیاحت پر روزانہ کالم لکھے گئے۔ ایرانی میگزین 'نجوم' میں اس سفر پر جانے سے قبل کا بہترین انٹرویو شائع کیا گیا۔ اس کے علاوہ

ایران میں انوشہ کے خلا میں جانے سے متعلق ہر ایک خبر کو کور کیا گیا۔

29 ستمبر 2006 کو انوشہ انصاری کی خلاء سے زمین پر کامیاب واپسی ہوئی اور اس سفر نے انہیں شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ سویوز راکٹ قزاخستان کی سرزمین پر اترا۔ انوشہ کے شوہر نے ان کا استقبال سرخ پھولوں اور پرنم آنکھوں سے کیا۔ خلائی اسٹیشن سے واپسی کا یہ سفر تین گھنٹے کا تھا۔ انوشہ کا کہنا تھا یہ دن میرے لیے بہت شاندار تھے۔ اگر مجھے دوبارہ ایسا موقع ملا تو میں بغیر تردد اسے حاصل کروں گی۔

انوشہ نے اس سفر سے واپسی پر کہا کہ ''یہ کامیاب ترین خاتون کہتی ہے کہ عورت خواہ کتنی بھی ترقی کیوں نہ کرلے اس کا وجود اپنے گھر اور اہل خانہ سے کبھی الگ نہیں ہو پاتا۔ وہ کتنی بھی مصروف ہو جائے، سکون اپنے گھر میں وقت گزار کر ہی پاتی ہے۔'' اس لیے انوشہ اپنی زندگی میں سکون، خوشی اور اطمینان کے لیے اپنے اہل خانہ کے ساتھ وقت گزارنے کو بہترین نسخہ بتاتی ہیں۔ ساتھ ہی مشورہ دیتی ہیں کہ خواتین کو کچھ وقت اپنے لیے نکالنا چاہیے۔ وہ یہ بھی کہتی ہیں کہ عمر سے کوئی فرق نہیں پڑتا، انسان کے حوصلے اور جذبات جواں رہنے چاہئیں پھر تو انسان بڑے سے بڑا کارنامہ انجام دے سکتا ہے۔

انوشہ انصاری کو اس عظیم کارنامہ کے لیے جو اعزازات اور ایوارڈ دیے گئے ان کی ایک لمبی فہرست ہے۔ اس کے علاوہ انوشہ اور ان کے خاندان کو سائنس اور ٹیکنالوجی کی خدمات کے لیے بھی ایوارڈ سے نوازا

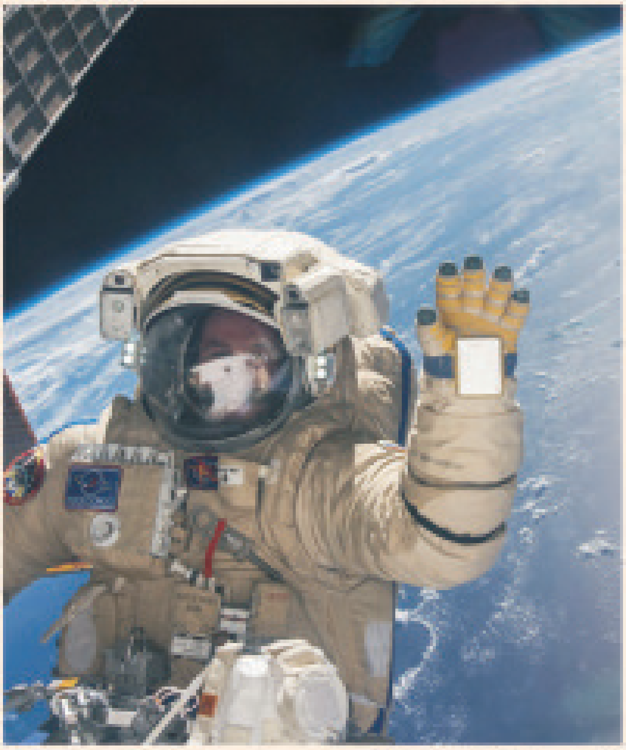

گیا۔ ان کے خاندان کو سائنسی ایجادات کے لیے معاونت کرنے والے ادارے ایکس پرائز (X Prize) کو عطیہ دینے والوں میں اولیت حاصل ہے۔

انوشہ موٹر سائیکل چلانے کی شوقین ہیں۔ روسی خلاباز میخائل ترن نے انوشہ کے حوصلہ مندی کی تعریف کی۔ انوشہ نے کہا کہ اگر ہمیں اپنا خواب پورا کرنا ہو تو اپنے دل میں اس کی آبیاری کریں اور موقع کی تلاش میں رہیں، صحیح وقت ملتے ہی اپنے خواب کو حقیقت میں بدل دیں۔ انوشہ انصاری کی ہمت، حوصلے اور ان کی وسیع النظری سے آج کی خواتین سبق حاصل کرتے ہوئے اپنے خواب کو حقیقت میں بدلنے کی کوشش کرسکتی ہیں۔ انوشہ اعلیٰ ہمتی اور بلند عزائم کی ایک اعلیٰ مثال ہیں۔

شاعرات کے منتخب اشعار

کائی لگی دیوار کی خوشبو، چاند، شفق
جب تم تھے تو سب کچھ اچھا اچھا تھا
مرے وجود پر وہ بن کے اوس کیا برسا
زمیں سے آنے لگی مجھ کو آسماں کی مہک

رشیدہ عیاں

ہر دل عزیز وہ بھی ہے ہم بھی ہیں خوش مزاج
اب کیا بتائیں کیسے ہماری نہیں بنی
دیوار و در میں سمٹا اک لمس کانپتا ہے
بھولے سے کوئی دستک دے کر چلا گیا ہے

بلقیس ظفیر الحسن

شہر میں، دشت میں گلزار میں کب جاتی ہے
میری آواز مرے گھر ہی میں دب جاتی ہے
بغاوتوں کو کچلنا ہی فرض ٹھہرا تو
امیر شہر مرے گھر سے ابتدا کرنا

رفیعہ شبنم عابدی

لے اڑا مجھ کو سر راہ گزر کس کا خیال
کچھ بھی اب یاد نہیں ہے کہ کدھر جانا تھا
کس طرح اس کی ہر اک پتھر مزاجی کا غرور
میں نے شیشے میں اتارا یہ کہانی پھر سہی

سیدہ شان معراج

میں اپنی ذات سے کیوں کر اسے الگ سمجھوں
کہ میری روح کے اندر اتر گیا ہے کوئی
یوں بھی ہوتی ہے کبھی پرسش احوال حیات
بھیگی آنکھوں سے ہر اک لفظ ادا ہوتا ہے

مسعودہ حیات

گو خوف سے عذاب کے لرزی ہوئی تھی میں
لیکن ترے کرم کو بھی پہچانتی تھی میں
توبہ کے ہیں کچھ پھول تو کچھ اشک ندامت
سوغات لیے بیٹھی ہوں آتے ہی نہیں وہ

بیگم رضیہ حلیم

تم پاس نہیں ہو تو عجب حال ہے دل کا
یوں جیسے میں کچھ رکھ کے کہیں بھول گئی ہوں
میں آندھیوں کے پاس تلاش صبا میں ہوں
تم مجھ سے پوچھتے ہو مرا حوصلہ ہے کیا

ادا جعفری

یہ جاگتی ہوئی آنکھوں کی لو ذراتی ہے
مری شبوں سے کسی خواب کا گزر ہوتا
ہر سانس انتظار ہے ہر گام اضطراب
شاید بلا رہی ہے تری رہ گزر مجھے

ساجدہ زیدی

وہ اک نگاہ کہ ہے چارہ گر بھی قاتل بھی
نہ جانے کتنوں کو جینا سکھا گئی ہوگی
وہ اک نگاہ جو اتری تھی حرف کن کی طرح
ہمارے دل میں سمائی تو کائنات ہوئی

ممتاز مرزا

ایک زندان حوادث میں ہے پابستہ حیات
فکر آوارہ سے پوچھو کہ کدھر جائے گی
یہ کس نگر میں آ گئے یہ کون سا مقام ہے
سیاہیوں کی دوپہر تمازتوں کی شام ہے

زاہدہ زیدی

دکھ اور طرح کے ہیں عذاب اور طرح کے
اس راہ میں آئے ہیں سراب اور طرح کے
آنکھوں میں لیے پھرتے ہیں خواب اور طرح کے
ہم لوگ کہ ہیں خانہ خراب اور طرح کے

صدیقہ شبنم

دل میں ہے ملاقات کی خواہش کی دبی آگ
مہندی لگے ہاتھوں کو چھپا کر کہاں رکھوں
ہماری عمر تو ہے بیل عشق پیچاں کی
ڈھلک پڑے گی اگر کوئی آسرا نہ ملا

کشور ناہید

میرے افکار کے ہمزاد رہا کرتے ہیں
کتنا آباد مرا گوشۂ تنہائی ہے
عمر بھر دیکھا ہوا وہ آرزو کا خواب تھا
کتنی آسودہ ہوئی ہوں اپنے ہی انکار سے

نور جہاں ثروت

ہونٹ لرزے آنکھ بھر آئی مری
تم بھی شامل تھے مری بارات میں
کب تک گھر کے حسابات میں الجھیں دونوں
آؤ بچوں کی طرح آنکھ مچولی کھیلیں

شائستہ یوسف

ہر گوشہ چمن کا مجھے مقتل سا لگا ہے
ڈھونڈھے سے بھی قاتل کا کہیں نام نہیں ہے
تم تصور کے تراشے ہوئے پیکر وہی
جس کو ہر رنگ میں دیکھا ہے سرابوں کی طرح

زبیدہ تحسین

کیوں گھر کے اب آئے ہیں یہ بادل یہ گھٹائیں
ہم نے تو تجھے دیر ہوئی یاد کیا تھا
اب اپنے آپ سے بھی چھپ گئی ہے
وہی لڑکی جو سب کو جانتی تھی

زہرہ نگاہ

کسی نے ہائے نہ پوچھا گلوں پہ کیا گزری
بہار بن گئی دورِ خزاں سنا میں نے
خدا کی شان کہ بادِ سموم کے جھونکے
چمن میں آ کے بہاروں کے راز دار ہوئے

وحیدہ نسیم

اردو صحافت کے سفر میں خواتین کا پہلا قدم

فرحت رضوی

اردو صحافت کے ارتقاء پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور ابھی بہت کچھ لکھے جانے کی گنجائش ہے۔ خاص طور سے اردو صحافت کے ارتقاء کی حصہ داری کے موضوع پر۔ اردو صحافت سے متعلق جب بھی کوئی کتاب یا خواتین نمبر ہاتھ لگا تو پڑھکر مایوسی ہی ہوئی کیونکہ خواتین صحافیوں، خواتین کے لئے نکالے گئے رسالے اور خواتین کی ادارت میں نکلنے والے رسالوں کے بارے میں تذکرہ کرنا محققین نے ضروری نہیں سمجھا۔ شاید اس بے توجہی کی ایک بڑی وجہ یہ رہی ہو کہ شروعاتی کئی دہائیوں تک خواتین کی صحافت ماہناموں ۔ پندرہ روزہ یا ہفت روزہ رسائل تک محدود رہی۔ روزناموں سے انکی وابستگی بہت بعد میں ہوئی۔ لیکن صحافت سے متعلق کتابوں میں جہاں اردو کے رسائل کا ذکر ہے وہاں بھی خواتین کے رسالوں کے ذکر سے گریز کیا گیا ہے۔ کئی برس پہلے جب جامعہ ملیہ اسلامیہ میں قومی کمیشن برائے خواتین کے اشتراک سے اقلیتی طبقے کی خواتین کی مختلف شعبہ ہائے زندگی میں کارناموں پر ایک نیشنل سیمنار کا انعقاد ہوا تو اردو صحافت میں خواتین کے رول، خاص طور سے شروعاتی دور کے رسائل اور صحافی خواتین کے بارے میں زیادہ تفصیلات نہیں مل سکیں۔ البتہ اردو میں خواتین کی ناول نگاری پر جن چند خواتین نے تحقیقی کام کیا ہے، جو کتابی شکل میں بھی آچکا ہے اس سے کچھ مدد ملی، جیسے بہار سے ڈاکٹر نسیم شمر فضل کی تحقیق 1991 پرمبنی کتاب مسلم خواتین کی جدید تعلیمی ترقی میں اردو ناولوں کا حصہ اور ڈاکٹر نیلم فرزانہ کی کتاب اردو ادب کی اہم خواتین ناول نگار 1992 اسکے علاوہ انگریزی کی کتاب جسے اے ایم یو کی ڈاکٹر ذکیہ صدیقی اور ڈاکٹر انور جہاں زبیری نے ایڈٹ کیا ہے، اے ایم یو کے پی آر او ڈاکٹر راحت ابرار کے تحقیقی مقالے پرمبنی کتاب مسلم تعلیم نسواں کے سوسال۔ چلمن سے چاند تک 2011 سے بھی کچھ حوالے ملتے ہیں۔ ڈاکٹر شگفتہ یاسمین کی تصنیف اردو کی مجلاتی صحافت اور غیرملکی ادارے تو ابھی دو سال پہلے 2014 میں قارئین کے ہاتھوں میں آئی ہے۔ تین سال قبل حیدرآباد میں خواتین کی صحافت پر ایک سہ روزہ

THE ZEBUNNISA

زیب النساء

ورکشاپ میں شرکت کا موقع ملا تو وہاں پڑھے گئے مقالوں سے بہت استفادہ ہوا۔ وہیں پر ڈاکٹر محمد ناظم علی نے اپنا تحقیقی مقالہ حیدرآباد کے ادبی رسائل۔ آزادی کے بعد حال تک 2010 نے اس موضوع پر میری راہ مزید آسان کردی۔ ڈاکٹر ناظم نے کئی خواتین کے رسائل کا ذکر کیا ہے جو حیدرآباد سے جاری ہوئے۔ یہ مقالہ بھی کتابی شکل میں آچکا ہے۔ مختلف صحافیوں اور ادیبوں کے مضامین پر مبنی دو کتابیں پہلی انور علی دہلوی کی مرتب اردو صحافت اور دوسری خالد محمود و سرورالہدیٰ کی ترتیب دی ہوئی اردو صحافت ماضی اور حال قابل ذکر ہیں۔ خاص طور سے مدھیہ پردیش، بہار، پنجاب، اترپردیش اور دہلی کی صحافت پر جو مضامین ہیں ان میں ممتاز مرزا اور نور جہاں ثروت کے مضمون اس پر روشنی ڈالتے ہیں۔

مدھیہ پردیش کے سینئر صحافی اشتیاق عارف کی تصنیف یادوں کی بازیافت اگرچہ طویل صحافتی خدمات کے دوران انکے ذاتی تجربات کی کہانی ہے لیکن بھوپال سے شائع ہونے والے الحجاب اور ''ظلّ السبحان'' جیسے خواتین کے رسالوں کے علاوہ انہوں نے ایک اور رسالے افشاں کا ذکر کیا ہے جو انکی ادارت میں خواتین کے لئے بھوپال سے جاری کیا گیا تھا لیکن وہ چار اشاعتوں کے بعد بند ہوگیا تھا۔ اس کتاب میں خالدہ بلگرامی کے روزنامہ آفتاب جدید میں تقرر کا بھی تذکرہ ہے جس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کسی اخبار کے دفتر میں وہ بھی روزنامہ میں کسی خاتون کا کام کرنا شجر ممنوعہ میں قدم رکھنے کے برابر ہے۔

اردو میں خواتین کے شروعاتی رسائل اور انکے ذریعہ عورتوں میں بیداری کس طرح پیدا کی اس ضمن میں دیوناگری میں شائع کلام نسواں کا ذکر اور سماجی فلاح کے لئے کام کررہے 'زنتر' ادارے کی خدمات کا اعتراف بہت ضروری ہے۔ کیونکہ اس موضوع پر اردو والوں کے بجائے ہندی میں ایک مثبت پہل ہوئی ہے۔ 'زنتر' جو تعلیم نسواں کے ذریعہ خواتین کو بااختیار بنانے کے لئے مسلسل کوشاں ہے اردو میں خواتین کے کچھ اولین رسالوں کے مضامین پر مبنی خصوصی ضمیمہ کلام نسواں کی اشاعت کی۔ یہ تحقیقی کام ہما خان نے اپوروا بھاردواج کی ادارت میں کیا ہے۔ بلکہ اپوروا بھاردواج اور انکی ٹیم نے مارچ 2016 میں یوم خواتین کے موقع پر اردو خواتین قلمکاروں کی تخلیق پر ایک مکالماتی اسٹیج شو بھی انڈیا انٹرنیشنل سینٹر میں پیش کیا تھا۔ اس پروگرام کے لئے انہوں نے 'تہذیب نسواں'، 'خاتون'، 'استانی'، 'پیامِ امید' اور 'عصمت' جیسے اولین رسالوں سے عورتوں کی تعلیم اور سوسائٹی میں انکی حیثیت، انگلستان میں بیداری نسواں کی جدوجہد، تحریک نسواں اور ہندوستان کی ریاستیں، خواتین کے لکھے گئے خطوط، انگریزی تعلیم کے خلاف بے جا تعصب، پردہ اور تعلیم، اسکول کی لڑکیاں اخلاقی اصلاح، شادی، آل انڈیا ویمن کانفرنس کا اجلاس، غیر ملکوں میں عورتوں کی ترقی کی رپورٹوں کا تجزیاتی مطالعہ کلام نسواں میں پیش کیا ہے۔ کلام نسواں نے ایسی قلمکاروں سے بھی تعارف کرایا ہے جو اپنے مضامین بجائے اپنے نام کے مسز س م د، بنتِ نصیرالدین حیدر، م ح ف دسنوی، اے ڈبلیو جی بیگم دہلوی، افسر دلہن، ح ن اہلیہ سراج الدین قدوائی وغیرہ وغیرہ کے نام سے لکھ رہی تھیں۔ مضامین کے لئے ان خواتین نے جو موضوعات منتخب کئے اگر انکا

تجزیہ کیا جائے تو آج اردو کے رسائل میں وہ تنوع نہیں ہے جس پر 19 ویں صدی کی آخری اور 20 ویں صدی کی شروعاتی دہائیوں میں ہماری بزرگ ادیبوں نے قلم اٹھانے کی جرأت کی تھی۔ جہیز کی مخالفت میں بڑی خوبصورتی سے افسر دلہن رسالہ خاتون میں ایرانیوں کی شادی کے بارے میں لکھتی ہیں ایران میں کمسنی کی شادی بالکل مفقود ہے۔ اگر چہ متوسط امراء میں منگنی کی رسم بہت جلد ادا کر دی جاتی ہے، لیکن شادی دولہا اور دلہن کے جوان ہونے تک نہیں ہوتی۔ مثل ہند ایران میں بھی لڑکی کی تلاش لڑکے کے والدین کرتے ہیں۔ انتخاب کے بعد لڑکے کی ماں یا دوسری رشتہ دار عورتیں ایک انگشتری اور دو شالہ لیکر لڑکی کے گھر جاتی ہیں اور لڑکی کے والدین سے یہ کہتی ہیں کہ میلے دارم فلاں پسر یا در غلامی فرمایند یعنی ہماری تمنا ہے کہ آپ فلاں لڑکے کو اپنی غلامی میں قبول فرمائیں۔ اسکے بعد مہر اور جہیز کا تصفیہ بھی اسی وقت ہو جاتا ہے۔ ان امور کے طے ہونے پر دولہا کی جانب سے دلہن کی ماں کے لئے ایک رقم حسب مقدورت بھیجی جاتی ہے جسکو ایرانی شیر بہا (دودھ کی قیمت) کہتے ہیں۔ دلہن کی ماں کے لئے کئی خوان میوے کے اور متعدد کشتیاں لباس و زیور کی بھیجی جاتی ہیں۔ چند روز بعد شادی ہو جاتی ہے۔

مذکورہ بالا اقتباس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس دور میں خواتین نے صحافت کے ذریعہ کس طرح اصلاح معاشرہ کے لئے اپنے قلم کا استعمال کیا۔

اردو نثر پر تحقیق کرنے والے اسکالروں نے عام طور پر 1898 میں لاہور سے مولوی ممتاز علی کی سرپرستی میں جاری 'تہذیب نسواں' کو اردو میں خواتین کا پہلا رسالہ قرار دیا ہے۔ دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل مولوی ممتاز علی سرسید کی اصلاحی تحریک سے متاثر تھے اور تعلیم نسواں کے بڑے حامیوں میں سے ایک تھے۔ تہذیب نسواں کی اشاعت بھی اسی مقصد کے ساتھ ہوئی، شروع میں اس رسالے کی ادارت کی ذمہ داری انکی صاحبزادی وحیدہ بیگم یعقوب علی نے سنبھالی بعد میں انکی دوسری بیوی محمدی بیگم کی ادارت میں تہذیب نسواں شائع ہونے لگا۔ قرۃ العین حیدر نے رسالہ خاتون میں شائع ایک مضمون میں تہذیب نسواں کو اردو میں خواتین کا پہلا رسالہ قرار دیتے ہوئے اسکا سن اشاعت 1886 لکھا ہے۔

صحافت میں بنگلہ زبان کو ہمیشہ اولیت حاصل رہی ہے۔ جسطرح اردو کے پہلے اخبار جام جہاں نما سے قبل بنگلہ زبان کا اخبار۔۔۔ آ چکا تھا۔ خواتین کی صحافت میں بھی بنگلہ زبان کا سفر پہلے شروع ہوا اور دوسرا نمبر پر رہی اردو۔ ذرائع کے مطابق باما بودھنی نام سے بنگلہ کا پہلا زنانہ رسالہ 1863 میں کلکتہ سے جاری ہوا۔ کلام نسواں کے مطابق 1875 میں بنگلہ کا اناپی 1878 میں 'پرسچار کا' کلکتہ سے ہی جاری ہوئے۔ اردو اور ہندی کا جہاں تک سوال ہے تو پورے وثوق سے تو نہیں کہا جا سکتا کہ ہندی سے پہلے اردو میں خواتین کا رسالہ منظر عام پر آ چکا تھا، لیکن ڈاکٹر سیمی ثمر فضل نے اپنے تحقیقی مقالے 'مسلم خواتین کی جدید تعلیمی ترقی میں اردو ناول کا حصہ' میں اردو کے دو ایسے رسالوں کا ذکر کیا ہے جو تہذیب نسواں سے پہلے شائع ہو چکے تھے۔ انکے مطابق مسلمان عورتوں میں تعلیم کی بیداری کے مقصد سے اردو کا پہلا رسالہ 1880 میں لکھنؤ سے 'رفیق النساء' کے نام سے جاری ہوا۔ (ڈاکٹر سیمی نے رفیق النساء کے مدیر یا مدیرہ کا نام نہیں لکھا

ہے) پھر 1884 میں سید احمد دہلوی نے دہلی سے اخبار النساء نام کا رسالہ شروع کیا۔ اخبار النساء کا ذکر دوسرے حوالوں میں بھی ملتا ہے۔ اسکے علاوہ 1882 میں محب حسین کا شفیق معلم نام کا رسالہ حیدرآباد سے شائع ہونا شروع ہو گیا تھا۔ یہ رسالہ بھی خواتین کی ذہنی بیداری اور تعلیمی ترقی کے مقصد سے شروع ہوا تھا۔ 10 سال بعد اسکا نام بدل کر معلم نسواں کر دیا گیا۔ محب حسین اس حد تک خواتین کی ذہنی بیداری اور تعلیمی ترقی کے حامی تھے کہ خود کو شروع میں خادم تعلیم لکھتے تھے بعد میں خادم نسواں لکھنا شروع کر دیا تھا۔

اردو۔ ہندی میں خواتین کے اولین جریدوں کے بارے میں جو باتیں قدر مشترک ہیں وہ یہ کہ صحافت کے میدان میں بطور رائٹر، ایڈیٹر یا پبلشر جن خواتین نے قدم رکھا، انکا تعلق متوسط اعلیٰ طبقے سے تھا، دوسرے انہیں اپنے گھر کے مردوں والد یا شوہر کی پوری سرپرستی حاصل تھی۔ گھر کا ماحول علمی و ادبی تھا۔ یہ خواتین اس وقت کے حساب سے تعلیم یافتہ تھیں۔ گھر کے مرد افراد جدید مغربی تعلیم اور اسکے فوائد سے بخوبی واقف تھے۔ اور ان میں سے کئی خود انگلستان یا دوسرے ممالک کی تعلیمی و سماجی ترقی سے متاثر تھے۔ اسکے علاوہ جن لوگوں نے آزادیٔ نسواں اور تعلیم نسواں کا بیڑا اٹھایا وہ کسی نہ کسی سماجی تحریک سے منسلک تھے۔ جیسے ہندی صحافت برہم سماج، آریہ سماج تحریک کی سرپرستی میں آگے بڑھ رہی تھی تو اردو میں خواتین کی صحافت پر سرسید تحریک، ڈپٹی نذیر احمد کی سماجی اصلاحی کوششوں اور سید احمد دہلوی کی تحریک کے اثرات کا سایہ تھا۔ سجاد حیدر یلدرم ترکی میں انقلابی تبدیلیوں سے بیحد متاثر تھے، انہوں نے اس مہم میں اپنی اہلیہ نذر سجاد کی پوری پوری حوصلہ افزائی کی۔ شیخ عبداللہ عرف پاپا میاں نے تو علیگڑھ میں لڑکیوں کا مدرسہ کھولنے کے ساتھ لڑکیوں کو تعلیم حاصل کرنے کی طرف راغب کرنے کے لئے ہی خاتون اور پھر راز ترقی جیسے رسالوں کی اشاعت شروع کی اور اس کام کے لئے انکی اہلیہ اور بیٹیوں نے مورچہ سنبھالا۔ بنگلہ کے مشہور ادیب رویندر ناتھ ٹیگور کی بہن اور بھانجی کو اپنے بھائی اور شوہر کی سرپرستی حاصل تھی، یہی حال ہندی صحافت کا تھا۔

البتہ ایک فرق یہ تھا کہ بنگلہ اور ہندی کے اولین خواتین کے رسالے خواتین کی ادارت میں ہی نکلنے شروع ہوئے، جبکہ اردو میں شمالی ہند میں سید احمد دہلوی (اخبار النساء) عبدالحلیم شرر (پردہ عصمت) اور دکن میں محب حسین (معلم شفیق و معلم نسواں) نے خواتین کی ذہنی تربیت کے لئے صحافت کا بیڑا اٹھایا انکی حوصلہ افزائی سے خواتین نے ماہناموں ہفت روزہ کے ذریعہ اردو صحافت کے میدان میں پہلا قدم رکھنے کی جرأت کی۔

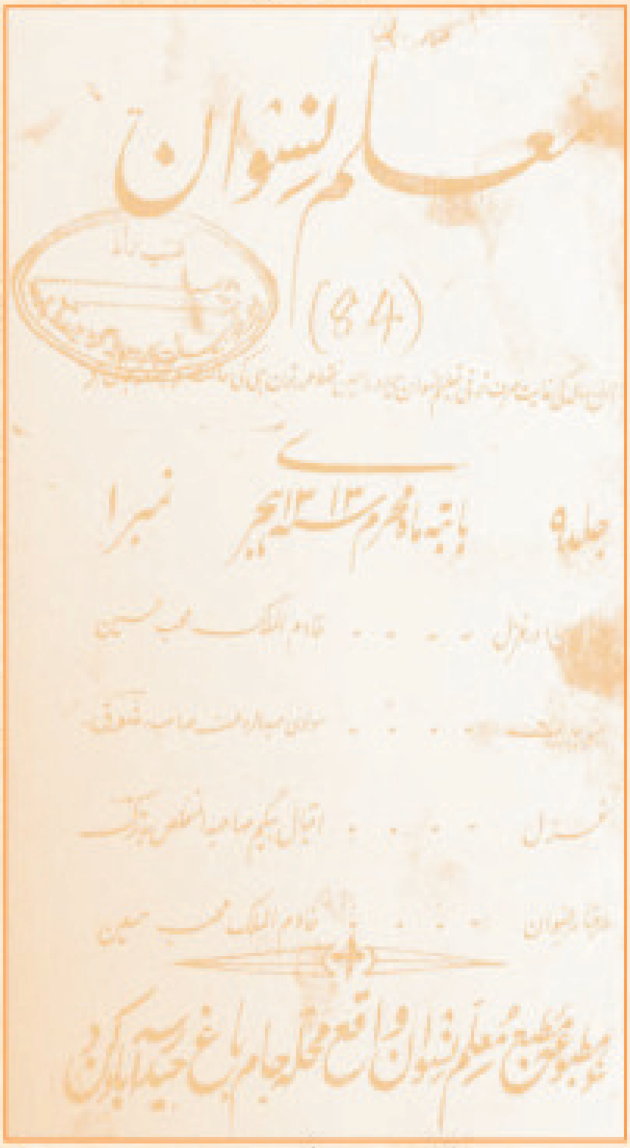

اردو میں خواتین کے رسالے کی اولیت کے حوالے سے ایک اہم بات کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے۔ ٹی وی اینکر ڈاکٹر شگفتہ یاسمین کی 2014 میں شائع کتاب اردو میں خواتین کی مجلاتی صحافت اور غیر ملکی ادارے میں شریف بی بی کو اردو میں خواتین کا پہلا رسالہ قرار دیا وہ لکھتی ہیں خواتین کے لئے پہلا رسالہ شریف بی بی کے نام سے محبوب عالم نے لاہور سے جاری کیا۔ لیکن ڈاکٹر شگفتہ نے شریف بی بی کا سن اشاعت نہیں بتایا۔ اگلی سطر میں حیدرآباد سے محب حسین کے ذریعہ خواتین کے

لئے نکالے گئے معلم نسواں کے بارے میں لکھتی ہیں کہ اسمیں مردوں کے علاوہ خواتین کے مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔ معلم نسواں کا سن اشاعت 1892 لکھا ہے جو صحیح ہے، لیکن معلم نسواں کے ایڈیٹر کا نام درج نہیں ہے۔ جبکہ ابھی تک اس موضوع پر تحقیق کرنے والے تمام حوالوں میں صاف لکھا ہے کہ محبّ حسین نے 1892 میں حیدرآباد سے معلم نسواں جاری کیا تھا، بلکہ اس سے دس سال پہلے 1882 میں انھوں نے خواتین کے مسائل اور دلچسپی کو مرکز میں رکھتے ہوئے معلم شفیق کے نام سے ایک رسالہ نکالا تھا بعد میں اسی کا نام بدل کر معلم نسواں کر دیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ڈاکٹر شگفتہ یاسمین شریف بی بی کو بغیر سن اشاعت بتائے اردو میں خواتین کا پہلا رسالہ بتا رہی ہیں، پھر دوسرے پیراگراف میں عصمت کے بارے میں لکھ رہی ہیں کہ 15 جون 1880 میں دہلی سے

علامہ راشد الخیری نے عصمت جاری کیا جو ادبی و علمی لحاظ سے خواتین کا پہلا مجلّہ تھا۔ اردو کے رسائل نسواں میں سب سے اہم دو رسالے تہذیب نسواں اور خاتون کا ذکر بھی ڈاکٹر شگفتہ نے سرسری انداز میں کیا ہے۔ تہذیب نسواں کے سن اشاعت اور جائے اشاعت کا تذکرہ ہی نہیں ہے، صرف مدیرہ اور سرپرست کے نام دئے ہیں، خاتون کا سن اشاعت اور جائے اشاعت لکھا ہے تو مدیرہ کا نام نہیں بتایا۔ لیکن اسکے بعد بیسویں صدی کی شروعاتی دہائیوں میں نکلنے والے تقریباً تمام اہم رسالوں کے نام گنائے ہیں۔ بلکہ انھوں نے کچھ ایسے رسائل کا بھی ذکر کیا ہے جنکا حوالہ دوسرے تحقیقی مقالوں میں نہیں ہے۔ جیسے ماہ نامہ تنویر، لیلیٰ، الزہرا، سہاگ، صدائے نسواں، خادم نسواں (بہت ممکن ہے کہ خادم نسواں کوئی الگ سے رسالہ نہ ہو کیونکہ معلم نسواں کو جاری کرنے والے محبّ حسین نے خود کو خادم نسواں لکھنا شروع کر دیا تھا، معلم نسواں کے سرورق پر اپنے نام کے ساتھ وہ خادم نسواں لکھتے تھے)۔ ڈاکٹر شگفتہ یاسمین نے اپنی کتاب میں خواتین کے تقریباً 29 اردو رسالوں کا ذکر کیا ہے، لیکن جائے اشاعت، سن اشاعت میں احتیاط نہیں برتی گئی۔

دراصل ڈاکٹر شگفتہ کی یہ کتاب رسائل نسواں پر تحقیقی کام نہیں ہے، بلکہ دو تین غیر ملکی اداروں کے بارے میں تحریر ہے اور اردو میں خواتین کے رسائل کے بارے میں انہوں نے دو۔ڈھائی صفحوں میں ضمنی ذکر کیا ہے۔ لیکن وہ طلبا جو اس موضوع پر تحقیق کر رہے ہیں یا مستقبل میں کریں گے، انکے لئے یہ تحریر تحقیقی نقطہ نظر سے سودمند نہیں ہے۔

پھول کھلے ہیں گلشن گلشن معروف فلم ٹی وی اداکارہ و اینکر تبسم نے اپنے ایک تفصیلی انٹرویو میں اس بات کی جانکاری دی ہے کہ انکی والدہ اصغری بیگم صحافی تھیں۔ تبسم کے مطابق انکے والد اجودھیا ناتھ سچدیو جو پنجابی تھے، شہید بھگت سنگھ کے ساتھیوں میں سے تھے اور انکی والدہ اصغری بیگم مسلمان تھیں۔ دونوں نے جدوجہد آزادی میں حصہ لیا اور دونوں اردو روزنامہ تیج (دہلی) میں کام کرتے تھے بعد میں بمبئی منتقل ہو گئے۔ وہ بتاتی ہیں کہ بمبئی آ کر میری والدہ نے عبدالحمید انصاری (مڈ ڈے گروپ کے خالد انصاری کے والد) کی مدد سے تنویر نام کا ماہنامہ نکالنا شروع کیا، جس میں جگر مرادآبادی، مجروح سلطان پوری، جوش ملیح آبادی، کیفی اعظمی اور ساحر لدھیانوی کی تخلیقات شائع ہوتی تھیں۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ جریدہ خواتین کے مسائل اور حقوق نسواں

پرچتی نہیں بلکہ ایک ادبی رسالہ رہا ہوگا، جسکی مدیرہ ایک خاتون تھیں۔ روزنامہ تیج میں اصغری بیگم کس حیثیت (بحیثیت سب ایڈیٹر یا پروف ریڈر) سے کام کرتی ہونگیں لیکن اس زمانے میں کسی اردو روزنامہ میں ایک عورت کا کام کرنا واقعی بڑے حوصلے کا کام تھا۔ بمبئی میں اصغری بیگم نے اسوقت کی مشہور اداکارہ کملا کوٹنیش اور گووندا کے والد ارون آہوجہ کو بھی اردو پڑھائی تھی۔ دوسری جنگِ عظیم کے وقت کاغذ مہنگا ہو جانے کے سبب تنویر کی اشاعت بند کرنی پڑی۔ ڈاکٹر شگفتہ یاسمین نے اپنی کتاب میں اس رسالے کا ذکر کیا ہے، البتہ جائے اشاعت سن اشاعت اور مدیر کے نام کا ذکر نہیں ہے۔

جس زمانے میں بنگلہ، اردو اور ہندی میں خواتین کے رسالے نکلنے شروع ہوئے وہ برصغیر میں سیاسی۔ سماجی تبدیلی کا دور تھا۔ راجہ رام موہن رائے کی برہمو سماج تحریک، سوامی وویکا نند کا رام کرشن مشن اور مسلمانوں میں سرسید احمد خاں کی تعلیمی اصلاحی تحریک، ڈپٹی نذیر احمد اور سید احمد دہلوی کے ذریعہ اصلاح معاشرہ کے علاوہ علیگڑھ میں شیخ عبداللہ عرف پاپا میاں کے ذریعہ آزادی، نسواں اور تعلیم نسواں و تہذیبی ترقی کے ضمن میں اصلاحی تحریکوں نے ملک میں دوسرے مذاہب کے ساتھ ساتھ خواتین کے لئے بھی ایک سازگار ماحول تیار کر دیا تھا۔ بھوپال میں نواب بیگم سلطان جہاں اور ان سے قبل دو اور بیگمات کی روشن خیالی، علم دوستی نے عورتوں کو ایک قدم آگے بڑھنے کا حوصلہ دیا تو جنوبی ہندوستان میں حیدرآباد کی علمی و ادبی فضا میں کئی روشن خیال خواتین اپنی تخلیقات کے ساتھ نمودار ہوئیں۔ کچھ یہی صورتحال پنجاب، بنگال، مہاراشٹر، اترپردیش کے بڑے شہروں کی بھی تھی۔ اصلاحی تحریکوں کے علاوہ عیسائی مشنریوں اور ذاتی طور پر کچھ انگریزوں کی کاوشوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں ڈیوڈ ہیئر ڈ اور اینی بیسنٹ کے نام اہم ہیں۔ انگلینڈ اور جاپان میں لڑکیوں کے لئے یونیورسٹیوں کے دروازے کھل گئے تھے۔ مسلم ممالک ترکی اور مصر میں تعلیم نسواں اور آزادی، نسواں کی تحریکوں نے بھی پڑھے لکھے مسلمان نوجوانوں کے سوچنے کا انداز بدل دیا تھا۔ ایک طرف مغربی جدید علوم، دوسری طرف روایتی و قیانوسی انداز فکر نے مسلمانوں کو سوچنے کے لئے مجبور کر دیا تھا۔

بیسویں صدی کی شروعات بہت خوش آیند ثابت ہوئی۔ 1900 میں لکھنؤ سے مولوی عبدالحلیم شرر نے پردہ عصمت نکالا۔ علی گڑھ سے

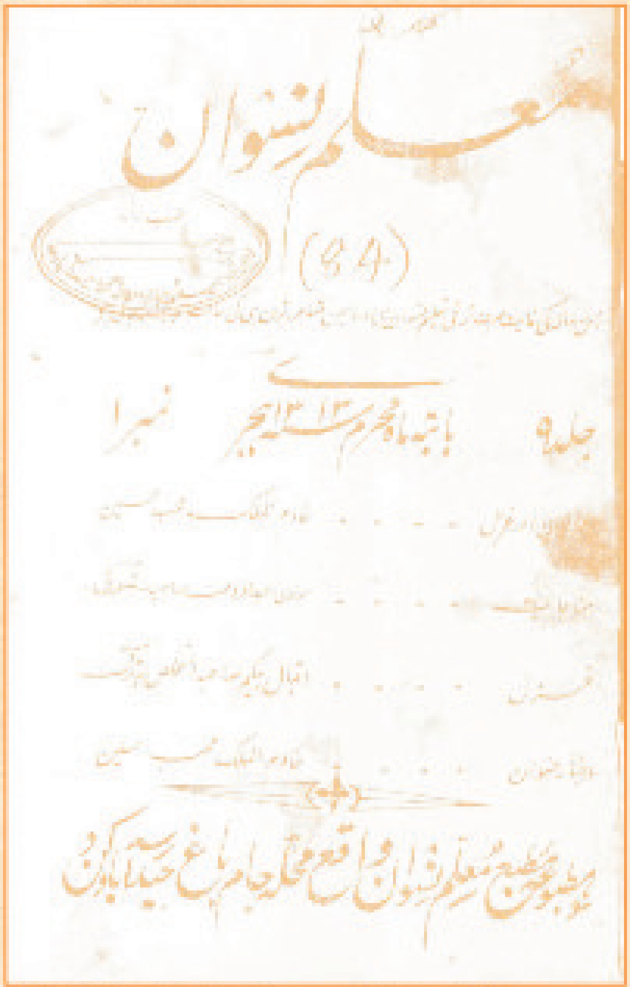

1940-50 میں شیخ عبداللہ کی قیادت اور انکی روشن خیال بیٹی ڈاکٹر رشید جہاں کی سرپرستی میں دو بڑے کام ہوئے۔ اول پہلی مسلم ویمن کانفرنس کا انعقاد، جس میں بھوپال کی نواب بیگم سلطان جہاں، بیگم حبیب الرحمان شیروانی، نذر سجاد حیدر، بیگم ہمایوں صغرا مرزا، بیگم امتیاز علی تاج، محمدی بیگم کے علاوہ دوسرے علاقوں کی تعلیم یافتہ خواتین نے شرکت کی تھی۔ دوسرا اہم کام اس سال خواتین کا سب سے اہم مقبول رسالہ خاتون کی اشاعت ہے۔ اس رسالے کے جاری ہونے کے بعد ان خواتین کو بڑی تقویت ملی جو قلم اٹھا کر اپنے دل کی بات سے اپنی دوسری بہنوں کو بتانا چاہتی تھیں۔ ابتدائی رسالوں میں ادبی صحافت کا اہم رول رہا ہے۔ اس طرح خواتین کی ناول نگاری کا ارتقا مان اولین اردو رسالوں کے ذریعہ ہوا۔

1908 میں دہلی سے علامہ راشد الخیری نے عورتوں کی اصلاح اور مشرقی تہذیب کے تحفظ کے لئے عصمت جاری کیا۔ 1909 میں ماہنامہ انجاب محمد قیصر کی ادارت میں بھوپال سے نکلنا شروع ہوا۔ جہاں تک

علامہ راشد الخیری کے عصمت کا سوال ہے وہ تعلیم نسواں (جدید) اور آزادیٔ نسواں کی حمایت میں نکلنے والے دوسرے رسائل سے مختلف علامہ کی سوچ کے مطابق مسلم گھرانوں میں روایتی آئیڈیل بہو۔ بیٹیوں کی تربیت پر زور دے رہا تھا۔ مشرقی معاشرے پر مغربی اثرات کے برے نتائج اور توہم پرستی کی مخالفت جیسے موضوعات تک یہ رسالہ محدود تھا۔ جبکہ پاپا میاں کی رہنمائی میں علیگڑھ سے شائع خاتون نے مسلم خواتین کو ایک ویژن، ایک جدید نظریہ فکر عطا کیا۔ ماڈرن ہندوستان کے لئے گھر کی چار دیواری سے نکل کر مسلم خواتین کی ذہن سازی میں خاتون کا اہم رول رہا ہے۔ خاتون میں چھپنے والے مضامین، افسانوں اور قسط وار ناولوں میں جدید تعلیم، عورتوں کے حقوق انکی آزادی، صحت نسواں، سماج میں عورتوں کی ثانوی حیثیت، دیسی تحریکوں میں خواتین کی شرکت، وطن پرستی اور مغربی علوم کے فائدوں کا ذکر ہوتا تھا۔ ناولوں کے نسوانی کرداروں کے ذریعہ قارئین کو سیکولر نظریہ فکر اور بیرونی رجحانات سے روشناس کرانا مقصود تھا۔ یہ کردار کہیں عدم تعاون کی تحریک میں فعال نظر آتے ہیں، تو کہیں سماجی اصلاح کی تحریکوں سے وابستہ۔ اس دور میں خواتین کے مسائل پر سنجیدہ فکر اور مقصد کے ساتھ لکھنے والی خواتین کی ایک چھوٹی سی فوج تیار ہو گئی اور انہیں کمک مل رہی تھی انکے گھر کے مردوں یعنی والد، شوہر یا بھائیوں کی طرف سے۔ ان میں محمدی بیگم، عباسی بیگم، اہلیٰ بی، نذر سجاد حیدر، بیگم شیروانی، بیگم امتیاز علی تاج، رشید جہاں، صغرا ہمایوں مرزا، بیگم شہنواز، فاطمہ بیگم وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

صحافت کے میدان میں شمالی ہند میں خواتین کی حوصلہ افزائی کے لئے جو کام پاپا میاں اور مولوی ممتاز علی اور انکے گھرانے کی عورتوں نے کیا دکن میں خود کو خادم نسواں کہنے والے محب حسین کچھ سال پہلے حیدرآباد میں شروع کر چکے تھے۔ 1882 میں محب حسین نے معلم شفیق نام سے ایک رسالے کی شروعات کی پھر دس سال بعد اسکا نام بدل کر معلم نسواں کر دیا۔ انکا مقصد عورتوں کی ذہنی بیداری، سماجی اصلاح اور ترکی و مصر جیسے ترقی پذیر ممالک کی طرز پر ہندوستانی عورتوں کی تربیت کرنا تھا۔

مجموعی طور پر اسوقت متوسط مسلم گھرانوں کی تعلیمی صورتحال افسوسناک تھی، تاہم اس طبقہ کی خواتین نے جنکا تعلق تعلیم یافتہ، روشن خیال اور خوشحال گھرانوں سے تھا انہوں نے آندھی میں چراغ جلانے کا فریضہ انجام دیا۔ انکی پیش قدمی نے آنے والی ایک نسل کو متاثر کیا۔

خواتین کو گھر میں انکی خانگی حیثیت اور گھر سے باہر انکی سماجی قوت (سوشل پاور) کا احساس دلایا۔ ملک اور بیرون ملک جو خواتین مختلف میدان میں نمایاں کام انجام دے رہی تھیں، انکی باقاعدہ رپورٹ شائع ہوتی تھیں۔ ترکی اور مصر میں شرعی قوانین میں ہونے والی تبدیلیوں کا ذکر بھی ملتا ہے اور خواتین کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں اور مظالم کی رپورٹنگ بھی معلم نسواں میں ہوتی تھی۔ خواتین کے اولین رسالوں میں جو چیز قدر مشترک تھی وہ تھی ادبی صحافت، جس کے ذریعہ وہ اپنے مقصد کے ساتھ قارئین تک پہنچتی تھیں۔ براہ سیاسی صحافت اور روزناموں میں انکی حصہ داری شروعاتی دور میں نہیں ملتی بلکہ 20 ویں صدی کی 9 ویں 10 ویں دہائی کے بعد سب سے پہلی مثال ہمیں قومی آواز میں نور جہاں ثروت کی ملتی ہے۔ انہوں نے خود ایک مضمون میں اس بات کا انکشاف کیا ہے۔ مجھے بذات خود اس بات کا تجربہ ہے کیونکہ 87-1986 میں موہن چراغی قومی آواز میں میرا تقرر کرانا چاہتے تھے لیکن ماحول سازگار نہ ہونے کی وجہ سے وہ اس سعی میں ناکام رہے۔ 1991 میں جب اردو ماہنامہ راشٹریہ سہارا کی شروعات ہوئی تو لڑکیوں کے لئے بھی دروازہ کھل گیا۔ پھر روزنامہ شروع ہوا تو کئی لڑکیوں کا تقرر ہوا۔

روزناموں میں خواتین کی شرکت سے پہلے، دہلی سے شائع ہونے والے ماہنامہ بانو کا ذکر ضروری ہے جو 1946 میں انور علی کی ادارت میں شائع ہوا پھر 1957 سے شمع پبلیکیشنز سے منسلک ہو گیا اور زینت کوثر دہلوی کی ادارت میں ایک عرصے تک شائع ہوتا رہا۔ 1929 میں میرٹھ سے ڈاکٹر حشمت آرا کی ادارت میں جاری خاتون مشرق کے سامعین کا بھی ایک الگ حلقہ تھا۔ خاتون مشرق جو ابھی تک دہلی سے شائع ہو رہا ہے، وہ اسی کا سلسلہ ہے یا دوسرا رسالہ ہے، اسکی تصدیق نہیں ہو سکی۔

بمبئی سے 1940 میں شائع ہونے والے پندرہ روزہ رسالہ رہبر مسلسل 20 برس تک مخصوص حلقہ سامعین کے درمیان اہم رول ادا کیا تھا۔ اسکی مدیرہ بھی کسی معمولی حیثیت کی خاتون نہیں تھیں اردو، دیوناگری اور گجراتی رسم الخط میں ایک ساتھ شائع ہونے والے رہبر کی مدیرہ معروف ریڈیو اینکر براڈکاسٹر امین سیانی کی والدہ پدم شری کلثوم سیانی تھیں، جنہوں نے مہاراشٹر میں غریب خاندان کی عورتوں کی تعلیم کے لئے مہم شروع کی۔ تعلیم نسواں۔ تعلیم بالغاں کے علاوہ 1940 سے لے کر 1960 تک رہبر کو تین زبانوں میں شائع کرتے ہوئے مسلسل 20

سال تک بطور مدیرہ یہ ذمہ داری بخوبی نبھائی۔ دراصل یہ رسالہ گاندھی جی کے لسانی فارمولے ایک زبان۔ دو رسم الخط ہندوستانی کو ملک میں رائج کرنے کے لئے نکالا گیا تھا۔ ملک کی مختلف جیلوں میں بند سیاسی قیدیوں

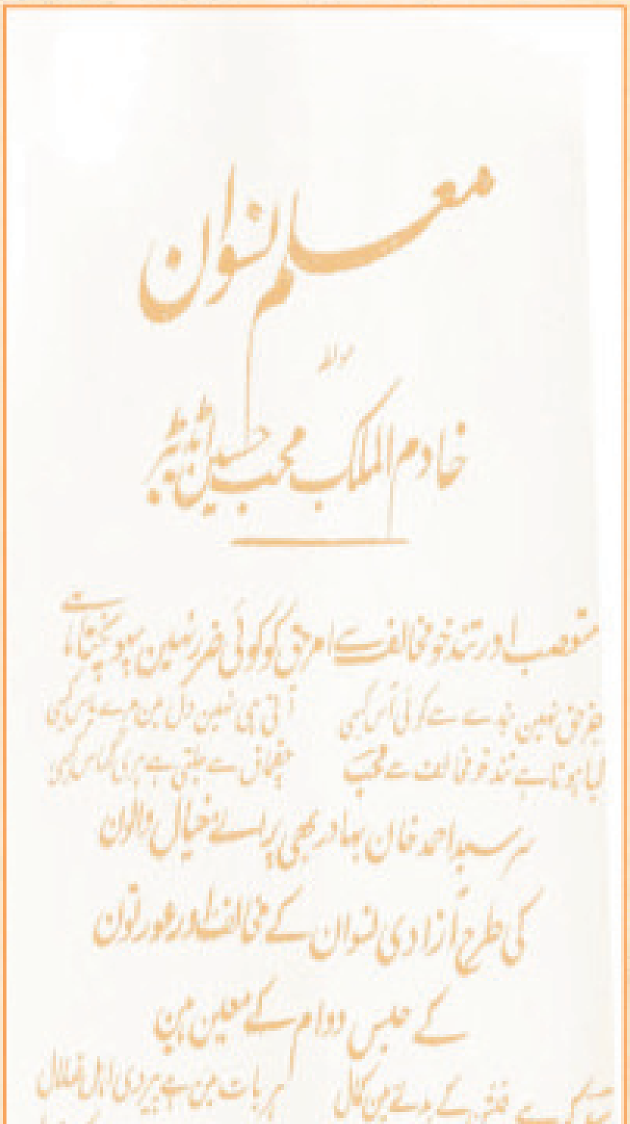

کے درمیان رہبر بیحد مقبول ہوا۔ کلثوم سیانی کو لکھے گئے گاندھی جی کے خطوط کی روشنی میں اس جریدے کی اشاعت کا مقصد سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ

بھی حیرت کی بات ہے کہ اردو صحافت کی تاریخ لکھنے والوں نے اس اہم رسالے کے ذکر کو بھی فراموش کیا ہے۔ کلثوم سیانی کی صحافتی خدمات کی جانکاری بھی انگریزی کے ذریعہ ملی۔ مندرجہ بالا جن تحقیقی مقالوں اور اردو صحافت پر مرتب کتابوں کا ذکر ہے ان میں کہیں رہبر اور اسکی مدیرہ کلثوم سیانی کا حوالہ نہیں ملتا۔ اس بیزاری کی شائد ایک وجہ اسکا تین رسم الخط میں شائع ہونا اور ملی جلی زبان ہے۔ مئی 2016 اردو دنیا کے صحافت نمبر میں کلثوم سیانی اور انکے صحافتی خدمات کا ذکر ایک انٹرویو میں انکے صاحبزادے امین سیانی نے کیا ہے اور اعتراف کیا ہے کہ بطور صحافی انکی تربیت رہبر کے لئے والدہ کے کام میں مدد کرنے کے دوران ہوئی۔ لہجہ کا منفرد انداز، زبان و بیان کی روانی اور صحیح تلفظ والدہ کی صحبت کا نتیجہ ہے۔

خواتین کی اردو صحافت کے باب میں عروس نو اور شمس النسا جیسے رسالوں جنکا تعلق بالا خانوں کی رخشندہ و تاریک گلیوں سے ہے، انکا ذکر ناگزیر ہے۔ طوائفوں کی دلچسپی اور مسائل کو مرکز میں رکھتے ہوئے خود اس طبقے کے ذریعہ جاری ہونے والے ایسے منفرد رسالوں کو بھی ہمارے مصنفین نے نظر انداز کیا ہے۔ جبکہ معاشی اور سماجی نقطہ نظر سے ان رسالوں کے مضامین کا مطالعہ و تجزیہ اہم نتائج اخذ کرنے میں مددگار ہوگا۔ ہماری زبان میں دشوناتھ طاوس نے اپنی یادداشت کی بناء پر عروس نو کا ذکر کیا ہے۔ انکے مضمون کے بعد اسی پرچے میں پٹنہ سے عطا عابدی نے چند مفروضات کے ساتھ ڈاکٹر لطیف احمد سبحانی کی کتاب ودربھ میں اردو صحافت کے حوالے سے شمس النسا جسکی ایڈیٹر اللہ دی نزاکت مراثن تھیں کے بارے میں لکھا ہے کہ اسکے علاوہ بھی بالا خانوں سے کئی اردو رسالے نکلتے ہیں۔ اس سمت میں بھی تحقیق کی گنجائش ہے۔

فی الوقت خواتین کی ادارت میں دہلی، علی گڑھ، بنگلور، سرینگر کشمیر سے کئی اردو ماہنامے، سالنامے نکل رہے ہیں لیکن مضامین کے تنوع کا فقدان اور معیار کی پستی کا شکار ہیں۔ ہمارے بزرگ صحافیوں کا صحافت کے تعیں نقطہ نظر اور مقصد بہت واضح تھا۔ پوری دیانت داری کے ساتھ انہوں نے صحافت کی ذمہ داری کو نبھایا، بھلے ہی روزناموں و سیاسی صحافت سے انکی وابستگی ذرا دیر سے شروع ہوئی۔ یہ کہنے میں عار نہیں کہ آج دوسری زبانوں کے مقابلے میں خواتین کی اردو صحافت کا معیار زوال پذیر ہے، موضوعات محدود اور وژن کا فقدان صاف نظر آتا ہے۔

اے روشنی فروش اندھیرا نہ کر ابھی

جویریہ قاضی

اخبار میں ایک خبر پڑھی کہ ایک ڈاکٹر نے انجکشن دیوار پر دے مارا کیوں کہ مریض کے پاس فیس کے پیسے نہیں تھے۔ کہیں دور جدید کا فرہاد مانجھی دکھائی دیتا ہے تو کہیں اپنی عمر سے بڑے کنستر لٹکائے کوئی بچہ دور حاضر کا شراون کمار دکھائی دیتا ہے اور کہیں اس مصرع کی عملی شکل بھی دکھائی دیتی ہے کہ اپنی ہی لاش کا خود مزار آدمی یعنی سن رسیدہ والدین کو گھر سے باہر نکال دیا جاتا ہے ایسے بے شمار واقعات ہماری نظروں سے گزرتے ہیں تو سوال اٹھتا ہے کہ علم کی روشنی سے منور یہ صدی ماتمی لباس میں لپٹی ہوئی کیوں ہے؟ اس کی چکا چوند میں انسانی زندگی کے نوحے کی بازگشت کیوں ہے؟ اس روشنی نے اندھیروں کو کم کرنے کی بجائے ظلمت کی سیاہی میں اضافہ کیوں کر دیا ہے تبھی دل سے بے ساختہ یہ آواز آتی ہے کہ اندھیرے کے ساتھ اجالا کیا ہے رات کے بعد دن کیوں ہے شر کے ساتھ خیر بھی ہے وہ یوں کہ ہر علم کے ساتھ اخلاق کا رہا ہے اگر زبان اور ادب کو ہی لیا جائے تو مسعود حسن رضوی کہتے ہیں۔

"شاعری بے حس قوتوں کو چونکاتی ہے سوئے احساس کو جگاتی ہے مردہ جذبات کو جلاتی ہے دلوں کو گرماتی ہے مصیبت میں تسکین دیتی ہے مشکل میں استقلال سکھاتی ہے بگڑے ہوئے اخلاق کو سنوارتی ہے اور گرتی ہوئی قوموں کو ابھارتی ہے۔ اور اس کا ثبوت یہ بھی ہے کہ صوفی سنتوں نے اصلاح معاشرہ کے لیے ادب کا سہارا لیا اور کامیاب بھی رہے۔

حالی کہتے ہیں:

صوفیائے کرام کے ایک جلیل القدر سلسلے میں سماع کو جس کا اہم جز اور رکن شعر ہے وسیلہ قرب الٰہی اور باعث تصفیہ نفس و تزکیہ باطن مانا گیا ہے۔

اچھا ادب بھی ہیجان عطا کرتا ہے وہ بھی نشہ پیدا کرتا ہے مگر اس نشے سے کام لیتا ہے زندگی کے عرفان کا خواب بھی عطا کرتا ہے مگر ان خوابوں سے حقائق کی توسیع کا کام لیتا ہے۔

حیوانات پر جب کوئی جذبہ طاری ہوتا ہے تو وہ آواز سے بیان کرتے ہیں اور انسان اپنے جذبات کو الفاظ سے ظاہر کرتا ہے علم کلام کی اہمیت مسلم ہے۔ لیکن طرز کلام کا اثر ہونا یا ذوق اذہان کی دلیل ہوتا ہے۔ جو آج کے پر آشوب دور میں عنقا ہو چلا ہے وجہ یہ ہے کہ اس بات سے ہم بخوبی واقف ہیں کہ گھر ہو یا دفتر اسکول ہو یا شاپنگ مال، تھیٹر ہو یا کاروبار ہر جگہ سائنس کی کرشمہ سازیاں از ہر من الشمس ہیں کیا آپ نے کبھی سوچا ہوائی جہاز اور خلائی جہاز قدیم داستانوں کے اڑن کھٹولے اور جادوئی قالین سے کوئی ربط ضرور رکھتے ہیں یا پھر نیل آرمسٹرام نے یہ نظم سنی ہو گی اماں باجی کہتی ہیں چاند میں پریاں رہتی ہیں ایک عرصہ پہلے غالب نے فرمایا۔

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ۔۔۔۔ خلائی سائنس بھی یہی راگ الاپ رہی ہے یقیناً انسان کا تخیل اپنے عہد سے آگے ہوتا ہے لیکن ایسی کون سی وجہ تھی کہ اردو کے صاحب اقبال یہ کہنے پہ مجبور ہوئے

"ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت"

اس دور جدید پر یہ شعر صادق آتا ہے۔ اب ہمارا ثقافتی اور سماجی منظر نامہ یہ سوال پوچھ رہا ہے کہ ادب میں ابتذال اور زندگی میں انتشار کیوں ہے؟ انسان روبوٹ اور سائے کی طرح محسوس ہوتے ہیں ان کے وجود میں دھڑ

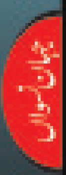

کتے ہوئے دل پتھر بن جاتے ہیں اور شاعر یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

ہوا کی میز بانی کرتے کرتے
شجر کی گود خالی ہو گئی ہے

کہاں گیا وہ دل جو جھولی بھر بھر خوشیاں لاتا تھا اب اس کی جگہ ایک گوشت کا لوتھڑا ہے یا خون پمپ کرنے والی مشین احساس کا وہ باطن چھن گیا ہے جو عدل و مساوات اور خیر کی باتیں کرتا تھا اب تو انسان کے ڈھانچے میں مادیت کا مواد بھرا ہوا ہے اسی لیے انکی آنکھوں میں نہ شفقت ہے اور نہ رویے میں نرمی، آج دنیا بھر میں ٹکنالوجی علم جمہوریت اور ترقی کی بہاروں کا موسم ایسا سازگار ہے کہ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے دلدل والے جنگلوں میں سرخ گلاب کھلنے سے ہر طرف شفق کا رنگ چھا گیا مگر ہمارے رویوں اور برتاؤ میں صرف کالے پھول ہی اگتے ہیں۔

ہم صنعتی دور کو برا کہہ کر اپنے قرض سے سبکدوش نہیں ہو سکتے ہاں اس دور کی کاروباری ذہنیت کو کم کر سکتے ہیں یہ کیسے مان لیا جائے کہ ابلیس آدم سے زیادہ کشش رکھتا ہے ہمیں آدم کی مسلسل جدو جہد اور دشواریوں کے باوجود فتح کے سبق کو عام کرنا ہے نیا تاج محل نہیں بن سکتا تو کیا ہم تعمیر چھوڑ دیں اور صرف رنگ محل بناتے رہیں؟۔اچھی بات چیت ایک سماجی روایت یہ آزادی اور ڈسپلن میں توازن قائم رکھتی ہے۔ آج جب کہ سائنس اور صنعتی ترقی بہت تیز ہے اس لیے انجینئر اور ڈاکٹر کو صرف ان کا فن ہی نہیں، الفاظ کا صحیح استعمال بھی سیکھنا چاہیے۔

زبان اگر ایک طرف آلہ تعلق ہے تو دوسری جانب وسیلہ اظہار بھی ہے اس کے بغیر انسان نہ تو سماج کی تشکیل کرتا ہے اور نہ سماج میں معنویت پیدا کر سکتا ہے۔ دراصل زبان ہی وہ وسیلہ ہے جس کے ذریعے انسان اظہار ذات کرتا ہے اور کبھی کبھی اس کے ذریعے اخفائے حال کا بھی کام لیتا ہے۔ زبان ہی زندگی میں زہر گھولتی ہے۔ محبت کا تریاق بھی عطا کرتی ہے۔ دردمندی اور دست گیری کا ہاتھ بھی بڑھاتی ہے۔ غرض زبان اور سماج کا ایسا رشتہ ہے جس کے بغیر نہ تو زبان کی ترقی ممکن ہے اور نہ سماج کی کارکردگی۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔

ذریعۂ ابلاغ کی حیثیت سے زبان کی اہمیت مسلم ہے۔ اسی سے سماج میں رابطہ قائم کیا جاتا ہے۔ اپنے گھر بازار میلے ٹھیلے اسکول کالج فیکٹری ہر جگہ زبان کی ہی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ زبان تہذیب کا بھی سرچشمہ ہے اور یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ زبان کے بغیر تہذیب گونگی ہے۔ لوک گیت، لوک کتھائیں اور شعر و ادب میں زبان کی جلوہ گری نظر آتی ہے۔ آداب زندگی میں شائستگی اور شستگی زبان سے ہی پیدا ہوتی ہے۔ اس عمل میں ہر قدم پر زبان کا عوام سے رشتہ قائم رہتا ہے۔

ابلاغ کے علاوہ زبان کے ذریعے دو اہم کام انجام پاتے ہیں ایک تو تفکر عمل میں آتا ہے اور دوسرے زندگی کے تجربات کی ترجمانی ہوتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ ذہن انسانی کی نشو و نما بھی ہوتی ہے۔ شیخ سعدی کے اقوام متحدہ کے صدر دروازے پر آویزاں مصرعے اس کا بین ثبوت ہیں:

بنی آدم اعضای یک دیگرند
کہ در آفرینش ز یک گوہرند
چو عضوی بہ درد آورد روزگار
دیگر عضوھا را نماند قرار
تو کز محنت دیگراں بی غمی
نشاید کہ نامت نہند آدمی

انسان ایک دوسرے کے اعضا کی حیثیت رکھتے ہیں کیوں کہ ایک ہی جوہر سے ان کی پیدائش ہوئی ہے۔ (حضرت آدم کی طرف اشارہ ہے)

جب زمانہ کسی ایک عضو کو درد میں مبتلا کرتا ہے
تو دوسرے اعضا کو بھی قرار اور چین نہیں آتا۔
اگر تو دوسروں کے غم اور تکلیف سے بے نیاز رہتا ہے
تو تیرا نام آدمی رکھنے کے لائق نہیں ہے۔ (تجھ میں آدمیت نہیں ہے)

ادب کیا ہے؟ اسکا وجود دنیا میں کیوں ہوا؟ اور انسان کی زندگی سے زبان و ادب کا تعلق کیا ہے؟

ادب ایک تاریخ ہے جس میں کسی ملک و قوم کے بدلتے ہوئے تمدن کی مسلسل تصویریں نظر آتی ہیں البتہ اسے پہچاننے کے لیے زردو سرخ کو پہچاننے والی نظر نہیں بلکہ سینہ کائنات کے راز تک رسائی حاصل کرنے والی نگاہ درکار ہے۔ اس لیے ادب اور جمالیات کی قدریں بھی پروان چڑھیں اور معاشرے میں صرف اقتصادی بوجھ ڈھونے والے آدمی نہیں انسان نظر آئیں۔

فنون لطیفہ بالخصوص ادب کسی نہ کسی حد تک قوموں کے عروج و زوال کی داستان ہوتے ہیں۔ ادب حال کا آئینہ اور مستقبل کی پیش بندی ہوتا ہے۔

یا یوں کہیں خزاں کی بے رنگیوں میں بھی صبح بہار کا رنگ قائم رکھا جاتا ہے۔ شعر و ادب کا کام ہمارے اندر حسن کا احساس پیدا کرنا ہے اور اس کو قائم رکھنا ہے یہ احساس حسن ہماری ابدی مسرت کی ضمانت ہے زندگی میں جتنی کریہہ اور بدصورت چیزیں ہیں ان کو بھی حسین بنا دینے کا نام "حسن کاری" ہے اور یہ کہا جائے کہ خواب اور حقیقت کے امتزاج کا نام ادب ہے تو درست ہوگا۔

سب نے دیکھا سب نے مانا
کھیل ہے یہ جانا پہچانا
راجا کا جوگی بن جانا
جوگی کا راجا بن جانا
اے۔ پی۔ جے بھی ایک جوگی تھا
لیکن ان کی بات الگ تھی
راجا بننے سے پہلے بھی
راجا بن کر بھی جوگی تھے
دامن جھاڑ کے راج محل سے
اُٹھے جب بھی وہ جوگی تھے
ایسا حاکم کوئی نہیں ہے
ایسا جوگی کوئی نہیں ہے

ہاں میری مراد اے پی جے کلام ہیں سائنسداں عموماً آفاق میں گم ہوتے ہیں لیکن یہ ان میں سے تھے جن میں آفاق گم تھا۔ اکثر سائنسی اصول ثبوت کے متقاضی ہوتے ہیں جب کہ تصور کی اُڑان اس سے آگے یہ ان کی جمالیاتی حس سے وابستگی کا اعجاز تھا کہ ہوائی جہاز میں اُڑتے ہوئے انہیں اپنی زمیں پیروں کے نیچے بہتی ہوئی لگتی۔ ہوا کے جھونکوں کے ساتھ سمندر کی لہریں بھی یاد آتیں اور روئی کے گالوں جیسے بادلوں میں کہیں یادوں کی کشتی تیرتی دکھائی دیتی اسے اس سائنسداں کا علمی تفاخر ہی کہا جا سکتا ہے۔ جو سائنس کی جدیدیت کے ساتھ روایت کے رچاؤ کا بھی قائل تھا یہ امتزاج بہت عمدہ تھا ہے ان کی نظمیں حب الوطنی کے جذبے کے ساتھ نوجوانوں کے لیے تحریک تو ہیں ساتھ ہی کسی بچے کے بچپن کی سادگی اور بھولا پن کو بھی پیش کرتے ہوئے بخوبی جتلاتی ہیں ان کا رشتہ آگہی سے جتنا گہرا تھا ان کے روح کا آتش کدہ بھی اتنا ہی روشن تھا یہ ان کی عظمت کو حقیقی سلام ہوگا اگر ہم ان کے خیالات کی اصل روح سے آگاہ ہوں جو ان کی نظموں میں ہے یہ وہ شعور ہے جو سورج کی شعاعوں اور حدت کے ساتھ آسمان کے نیلے رنگ اور شفق کے سرخ رنگ کا ادراک بھی رکھتا ہے۔

کوئی نغمہ دھوپ کے گاؤں میں کوئی نغمہ شام کی چھاؤں سا
ذرا ان پرندوں سے پوچھنا یہ کلام کس کا کلام ہے

حالانکہ ایسی کئی مثالیں سامنے آتی ہیں کہ نامور سائنسداں اور طبیب اپنی طبیعت کے سکون کے لیے یا اپنے ذوق کی تسکین کی خاطر ادب سے وابستگی رکھتے ہیں۔

علم بیان اور تحریر کی مسلّم اہمیت کا بیان اللہ تعالیٰ نے سورۂ رحمن میں جس طرح سے کیا ہے وہ سب سے بڑا حوالہ ہے کہ انسان علم بیان اور قلم سے کائنات میں اپنی برتری کے ساتھ اپنے انسانی جوہر کی پرداخت بھی کرتا ہے۔

حیات تازہ کی افکار تازہ سے ہے نمو
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا
وہی زمانے کی گردش پر غالب آتا ہے
جو ہر نفس سے کرے عمر جاوداں پیدا ■

عورت کمزور نہیں

ہاجرہ بانو

یہ مانا محبت کی منزل ہے عورت
تڑپتا مچلتا ہوا دل ہے عورت
پر اس کے زمان و مکاں اور بھی ہیں
ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

عورت کے خمیر کی خوشبو کو محسوس کر کے سردار جعفری نے جب یہ مصرعے لکھے ہوں گے تو مسرت کی سرشاری کے احساس نے ان کے روم روم میں شرارے بھر دیے ہوں گے۔ ان کے تخیل کے افق پر وہ کون سے بلوریں شفاف رنگ ہوں گے جنہوں نے انہیں یہ بشارت دی ہوگی کہ صنف نازک کے پنچھ زمان و مکاں کے قفس میں قید نہیں رہ سکتے؟ وہ کون سی تابندگی ہوگی جس کے نور سے وحی آئی ہوگی کہ اس ناتواں سی نظر آنے والی ہستی کے جہاں تو ستاروں سے آگے اپنی منزل رکھتے ہیں؟

سوندر یہ ہے ساکشات جیوت پیار ہے ناری
شوبھا اسی سے سرشٹی کا شرنگار ہے ناری
یہ موتی ممتا سندرتا سینیہہ دیا کی ہے
خود آنسوؤں کا پورن پار اوار ہے ناری
ہے آگ پانی ایک ساتھ وسنت پت جھڑ بھی
ہے موم کی گڑیا تو کبھی انگار ہے ناری
وہ دھرم سنسکرتی کی دھرتی ہے شا شیل
یگ سبھیتا کی پرگتی کا آدھار ہے اناری
کاتھا پربل تم شوریہ کی اتہاس میں انکت
ہے ویرتا تلوار اس کی دھار ہے ناری
پتی، پتر، بھائی کو نچھاور دیش پر کرکے
سوا دھنیتا کے ہت ہوئی خود نثار ہے ناری

چندر سین وارث نے کس سوندریہ میں آگ اور پانی کے سنگم کو دیکھا تھا؟ موم نے آگ بن کر کسے جھلسایا تھا؟ وطن کی مٹی کا قرض ناری پر اتنا کیوں چڑھا کہ صدیوں سے اپنے پتی، پتر، بھائی کو نچھاور کرنے کے بعد بھی وہ رن مکت نہیں ہوئی؟ شہیدوں کے ساتھ ان ماؤں کو کیوں اتنے کوئی کوئی پرنام کیے جاتے ہیں؟ جتنے شنکر پرساد کیوں ناری کو کیول شردھا مانتے ہیں؟ شنکر سلطان پوری کی ''ناری تیری عجب کہانی'' کیوں یوون کے پیالے اور مدرا کے پیالے لٹاتی ہے؟ ناری کو ممتا کی مورت اور جگ جننی پیاری صورت بتاتی ہے کیوں؟ اقبال کی بے رنگ کائنات میں زن کا وجود کیوں رنگ بھرتا ہے؟ ان کی زندگی کا سوز دروں اسی ساز سے منسلک کیوں ہے؟ ثریا کی مشت خاک کا شرف کون سا درجہ رکھتا ہے؟ شرار افلاطون کو زن کے شعلے نے ہی کیوں جلایا؟ کیفی اعظمی کیوں تاریخ کو عورت کی قدر کرنے کا مشورہ دیتے ہیں؟ انہوں نے خوبصورت چشم آہو کے اشک میں پوشیدہ شعلوں کی تپش کو کہاں محسوس کیا؟ کیفی کو عورت کی کہانی میں کون سی حقیقت نظر آئی؟ کھجوراہو اور اجنتا کے فن میں کس ہستی نے سوچنے پر مجبور کیا؟ کیفی کی شاعری کیوں دل میں انجذاب ہو کر عورت کو سلام کرتی ہے؟ کیا انہوں نے عورت کی مٹھی میں افلاک اور ٹھوکر میں ارض کو دیکھ لیا تھا؟ میدان زندگی میں ہر مقام پر کسی سے پیچھے نہیں رہنے والی وہ ابلا ناری کو ساحر شیوی کیوں مردوں کے برابر سمجھ کر یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ

کندھوں سے کندھا ملا کر آج کل چلتے ہیں ہم
مت سمجھنا آج کی عورت کو ہے مرد سے کم

ایک سنسکرت شلوک کیوں کہتا ہے کہ جہاں عورت کی عزت ہوتی ہے وہاں دیوتا قیام کرتے ہیں؟

خدا کی رحمت و گھر کی برکت والی یہی عورت ازل سے لے کر آج تک دوراہے پر کھڑی ہے۔ اس کا اپنا کوئی مقام نہیں۔ یہاں تک کہ مادر رحم میں بھی اسے پنپنے کا حق نہیں۔ اس رحمت کی دیوی کے کونپل کو کچلنے کی تعداد بتانا مقصد نہیں۔ کہاں اور کتنی جگہ وہ مساویانہ حقوق رکھتی ہے یہ بتانا بھی میری منشا میں شامل نہیں۔ ایف آئی آر FIR کی ان رپورٹس پر روشنی ڈالنا بھی میرا مقصد نہیں کہ پٹرول، مٹی کے تیل، تیزاب اور دیا سلائی اس کی حق مغفرت میں دعا گو ساتھی بنے۔ مذہب کی آڑ اور جھوٹی شان کے نام پر مر مٹنے والوں کے گھر دم توڑتی، گھٹتی، سسکتی، شب غم کے اشکوں سے

جیسے بھگوتی اور کھوکھلی خاندانی جاہ وجلال کا شکار ہوتی ان لڑکیوں کی داستان سنانا بھی میرا مقصد نہیں۔ باطل عقائد، مادہ پرستی، تشنہ درندوں کی جبرا پیاس بجھاتی ان آہوں کا ذکر کرنا بھی میرا ارادہ نہیں۔ مرکزی و ریاستی حکومتوں، سماجی مصلحین، مفکرین، قانون ماہرین اور انقلابی خواتین کی بے بسی و مایوسی درشانا بھی میرا مقصد نہیں۔ دختر کشی، خواتین کی فلاح و بہبود، تحریک نسواں کے حقوق کی جدوجہد کو کاغذ کے پرزوں میں دم توڑتے دکھانا بھی میرا مقصد نہیں۔

میرا مقصد تو یہ ہے کہ کوئی تو سامنے آئے اور عورت کو اس کا صحیح مقام بتادے چاہے وہ جہنم کا ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن مدلل جواز پیش کرنے کا حق اسی کو ہوگا جس پر کسی عورت نے کوئی احسان نہ کیا ہو۔ اگر وہ نو ماہ کسی ٹیسٹ ٹیوب میں بھی رہا تو یہ ثابت کرے کہ اس کی نگہداشت کسی نرس نے نہ کی ہو۔ اور پھر مندرجہ ذیل تمام پرسش کے جوابات دے کر بتائے کہ عورت کہاں کمزور ہے۔

سلطان التمش کے 19 بیٹوں میں سے رضیہ سلطان ہی دلی کے تخت پر کیوں بیٹھی؟ انگریزوں کے ناپاک قدم اکھاڑنے کا عزم رانی جھانسی نے کیوں لیا؟ ساوتری بائی پھلے نے تعلیم کی جوت کیوں جلائی؟ نوبل پرائز ونر مدر ٹریسا نے 168 چیریٹی ہوم کس طرح قائم کیے؟ آنندی بائی گھر گرہستی چھوڑ کر ڈاکٹر کیوں بنی؟ سرپہ فلک کو چھونے کا خیال بچھیندری پال کو کیوں آیا؟ سات سروں کو اپنے بس میں کرکے ایم سبالکشمی بھارت رتن ملکہ موسیقی کیوں بنی؟ مادر وطن کا پرچم لہرانے والی مادام بھیکا جی کاما کو سرزمین ہندوستان کیوں سلام کرتی ہے؟ سنتوش یادو کو ایوریسٹ کی چوٹیاں کیوں بلاتی تھیں؟ سرلا ٹھکرال اپنا ایئر کرافٹ لے کر آسمان کی سیر کو کیوں نکل پڑی؟ DBP قانون کی وردی کنچن چودھری پر کیوں جچتی تھی؟ پی ٹی اوشا دوڑ کر اولمپک میں تمغے کیوں لے آئی؟ آشا پورنا دیوی گیان پیٹھ حاصل کرنے کے لیے کتنی ادبی جدوجہد کرتی رہی؟ سفیر اول وجے لکشمی پنڈت نے زندگی میں کتنے نشیب و فراز دیکھے؟ میرا کل دومن ٹیسی تھامس کس طرح منزل تک پہنچی؟ اپنے سحر آفرینی حسن کا خطاب مس یونیورس جب سشمیتا سین کو ملا تو ہندوستان کو کیسا محسوس ہوا؟ آنکھوں پر بندھی پٹی اور ہاتھ میں ترازو لے کر کھڑی انصاف کی دیوی کے سامنے بیٹھ کر اول جج لیلا سیٹھ نے کس طرح فیصلے کیے؟ کارنیلیا سیراب جی نے وکیل اول بن کر کتنے مقدمے لڑے؟ لیفٹننٹ جنرل ڈاکٹر سنیتا اروڑہ فتح گڑھ کے ڈاکوؤں سے خوفزدہ کیوں نہیں ہوئی؟ کلکتہ نندی گرام تھانہ کی پہلی قاضی شبنم آراء کو مسلم معاشرے میں کتنی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا؟ گورنر سروجنی نائیڈو نے کس طرح انگریزوں کے خلاف کام کیا؟ سینٹرل ریلوے نے سومیا راگھون کو جی ایم GM کیوں بنایا؟ آیانا مستری کی انگلیوں پر کتنے طبلے ٹوٹے؟ صحافت کی دنیا میں ہولی ویاروالا نے کون سے کارنامے انجام دیے؟ یونین جیک کی جگہ ترنگا لہرانے والی ارونا آصف علی کو کتنے انعامات و اعزازات سے نوازا گیا؟ سرود کے تار چھیڑتی شرن رانی باکلی وال نے سنگیت کے لیے پوری دنیا کا سفر کیوں کیا؟ اروندھتی رائے بین الاقوامی شہرت کی حامل کیوں بنی؟ ساتوں سمندری لہروں پر تیرنے والی بلا چودھری کے سامنے طوفانوں نے کیوں ماتھا ٹیکا؟ ہانگ کانگ اور شنگھائی بینکنگ کارپوریشن HSBC نے نینالال قدوائی کو ذمہ داری کیوں سونپی؟ ہندوستان کے لیے اندرا گاندھی کے کتنے خون کے قطرے ٹپکے؟ کرن بیدی کو IPS کا عہدہ کیوں سلام کرتا ہے؟ کلپنا چاؤلہ فضاؤں میں کیوں ولین ہوگئی؟ صدر جمہوریہ ہند کے لیے پرتبھا تائی پاٹل میں کون سی خوبیاں نظر آئیں؟ ثانیہ مرزا کیوں سب کی چہیتی بنی؟ پہلی لوک سبھا اسپیکر میرا کماری کی آواز کب گونجتی ہے؟

ایسے ہزاروں سوالات ہیں ان کے لیے جو عورت کو ابلا، کمزور اور ناتواں سمجھتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے لیے حقیقت کا اعتراف کرنا اپنی انانیت کی کمزوری کا اظہار ہے۔ اس لیے ناری کے گلنار رخساروں کو صرف عیش وعشرت کا سامان سمجھ کر کچھ ایسی درندگی کا مظاہرہ کرتے ہیں جس کے اثرات کئی میلوں تک نظر آتے ہیں اور نتیجتاً ایسے لوگ صرف صنف نازک کے ہی دشمن نہیں ہیں بلکہ اپنی قوم کو صدیوں پیچھے لوٹانے کے بھی ذمہ دار ہیں۔ کبھی مذہب کے نام پر، کبھی نفرت کے نام پر، کبھی سماج کے نام پر یہاں تک کہ محبت کے نام پر بھی عورت کا استحصال کرتے رہتے ہیں۔ بار بار اسے یہ احساس دلایا جاتا ہے کہ وہ کمزور ہے اور بنا کسی سہارے کے اپنی زندگی نہیں گزار سکتی۔ عورت کو کچل کر رکھنے والوں کو کہیں یہ ڈر تو نہیں کہ ان کی کھوکھلی طاقت کے دعوے غلط ثابت ہوجائیں اور معاشرے پر ان کی گرفت کمزور نہ ہوجائے۔ ناری شکتی کو سلام کرنے کے لیے ان کے آہنی جسم میں جھکنے کی طاقت نہیں۔ اللہ کی رحمت اور گھر کی برکت کو روند کر انہیں کہیں اپنے شیطانی چہرے پر پڑے انسانی نقاب ہٹ جانے کا خوف تو نہیں؟ کہیں انہیں کو یہ خوف تو نہیں کہ حوا اپنا انتقام نہ لے لے؟ اپنی مصروف زندگی میں سے صرف چند ثانیے نکال کر ذہن پر ہلکا سا زور ڈال کر ان سوالات پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ■

پہلی قسط

تعزیرات ہند اور خواتین
جنسی و دیگر جرائم

خواجہ عبدالمنتقم

تعزیرات ہند (Indian Penal Code) ہندوستان کا اہم ترین اور عام تعزیری قانون ہے جس میں مختلف جرائم کی تعریفات اور ان کی سزاؤں کی تفصیل واضح طور پر دی گئی ہے۔ یہ قانون غیر منقسم ہندوستان میں 1860 میں منظور کیا گیا تھا اور دیگر قوانین کی طرح آزاد ہندوستان میں بھی اس قانون میں وقتاً فوقتاً بہت سی ترامیم کی گئی ہیں اور کچھ نئی دفعات کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ اس قانون کا مسودہ لارڈ میکالے اور ان کے زیر نگرانی قائم کی گئی ایک کمیٹی نے تیار کیا تھا۔ یہ مسودہ انتہائی محنت اور نہایت احتیاط کے ساتھ تیار کیا گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس قانون کی مختلف دفعات کو جب جب عدالت کے روبرو چیلنج کیا گیا تو وہ انصاف کی کسوٹی پر پوری اتریں اور چند دفعات کے علاوہ جنھیں وقت اور حالات کے مطابق بدلنا پڑا باقی دفعات تاہنوز اپنی اصل شکل میں موجود ہیں۔ جنسی جرائم و دیگر جرائم کے بڑھتے ہوئے گراف کی روشنی میں خواتین کے لیے یہ جاننا ضروری ہو گیا ہے کہ کون کون سے جرائم جنسی جرائم کے دائرے میں آتے ہیں اور ان کی کیا سزا ہے اور یہ کہ وہ اس سلسلے میں کیا قانونی کارروائی کر سکتی ہیں۔

اگرچہ وشاکھا اور دیگر بنام ریاست راجستھان والے معاملے (1997)2 ایس سی سی 241 میں سپریم کورٹ خود اس بات کو تسلیم کر چکی ہے کہ عورتوں کی عصمت کا تحفظ ان کا ایک بنیادی حق ہے مگر اس سب کے باوجود نہ صرف ہمارے ملک میں بلکہ تمام دنیا میں خواتین مکمل جنسی تحفظ سے محروم ہیں اب تو بہت سے کمسن اور کم عمر بچے بھی اس قسم کے جرائم کا ارتکاب کر رہے ہیں اس سلسلے میں ہمارے عوام اور حکومت دونوں کو ہی کافی تشویش ہے چونکہ نو عمر مجرمین کو Juvenile Act کے تحت تحفظ حاصل ہے اور انھیں دی جانے والی سزا بھی بہت کم ہے۔ عالمی بینک کی ایک رپورٹ کے مطابق خانگی اور جنسی تشدد میں مرنے والی عورتوں کی تعداد کینسر، سڑک حادثات، جنگ اور ملیریا میں مرنے والی عورتوں کی تعداد سے کہیں زیادہ ہے۔ خود ہمارے ملک میں خواتین کی آبرو ریزی کے واقعات ملک کے مختلف حصوں میں پیش آتے رہے ہیں۔

اس مجموعے کی مندرجہ ذیل دفعات خواتین سے متعلق جرائم و دیگر امور سے متعلق ہیں اور ان دفعات میں سے کسی کی بھی خلاف ورزی کیے جانے پر متعلقہ فوجداری عدالت میں معاملہ دائر کیا جا سکتا ہے۔

- خواتین کی آبرو ریزی، اغوا، فاسقانہ بیوپار، ناجائز جنسی مباشرت وغیرہ سے متعلق جرائم

ایسی صورت جبکہ جسم کی حفاظت خود اختیاری کا حق کسی شخص کو ہلاک کرنے تک تجاوز کرتا ہے

When the right of private defence of the body extends to causing death

دفعہ **100**: آخری متذکرہ دفعہ میں درج قیود کے تحت جسم کی حفاظت خود اختیاری کا حق حملہ کرنے والے کو بالارادہ ہلاک کرنے یا کوئی دوسرا نقصان پہنچانے تک تجاوز کرتا ہے، اگر ایسا جرم اس حق کے استعمال کا باعث ہو جو مندرجہ ذیل صورتوں میں سے کسی میں شامل ہو، یعنی—

پہلی— حملہ ایسا ہو کہ جس میں اس بات کا معقول وجہ سے اندیشہ ہو کہ اگر اس حملے سے حفاظت نہ کی جائے تو ایسے حملے کا نتیجہ ہلاکت ہوگا؛

دوسری— حملہ ایسا ہو کہ جس میں اس بات کا معقول وجہ سے اندیشہ ہو کہ اگر اس حملے سے حفاظت نہ کی جائے تو اس کا نتیجہ ضرر شدید ہوگا؛

تیسری— ایسا حملہ جو زنا بالجبر کے ارتکاب کی نیت سے کیا جائے؛

چوتھی — ایسا حملہ جو خلاف وضع فطری شہوت پوری کرنے کی نیت سے کیا جائے؛

پانچویں — ایسا حملہ جو بھگالے جانے یا اغوا کرنے کی نیت سے کیا جائے؛

چھٹی — ایسا حملہ جو کسی شخص کو حبس بے جا میں رکھنے کی نیت سے ان حالات کے تحت کیا جائے جن سے اس کو اس بات کا اندیشہ معقول وجہ سے پیدا ہو کہ وہ اپنی رہائی کے لیے سرکاری حکام سے مدد نہ لے سکے گا؛

ساتویں — تیزاب پھینکنے یا لگانے کا ایسا فعل یا تیزاب پھینکنے یا لگانے کے ایسے فعل کی کوشش جس کے نتیجے میں ضرر شدید پہنچنے کا معقول اندیشہ ہو۔

عورت کی عصمت دری کی نیت سے اس پر حملہ یا جبر مجرمانہ کا استعمال

(Assault or criminal force to woman with intent to outrage her modesty)

دفعہ **354**: جو کوئی کسی عورت پر اس کی عصمت دری کی نیت سے یا اس امر کے امکان کے علم سے کہ وہ اس فعل سے اس کی عصمت دری کرے گا، حملہ کرے یا جبر مجرمانہ کا استعمال کرے، اسے دونوں میں سے کسی بھی قسم کی کم از کم ایک سال کی اور زیادہ سے زیادہ 5 سال تک کی سزائے قید دی جائے گی اور وہ جرمانہ کا بھی مستوجب ہوگا۔

جنسی ایذادہی اور اس کی سزا

Sexual harassment and punishment for sexual harassment

دفعہ **354 الف**: (1) مندرجہ ذیل حرکات میں سے کوئی بھی حرکت کرنے والا شخص جنسی ایذادہی کے جرم کا مرتکب ہوگا۔

(i) جسمانی لمس و پیش رفت جس میں ناشائستہ جنسی پیش رفت و شہوانی خواہش کا اظہار شامل ہے؛ یا

(ii) التفات جنسی کی طلب یا درخواست؛ یا

(iii) کسی عورت کو اس کی مرضی کے خلاف فحش تحریر یا تصویر (pornography) دکھانا؛ یا

(iv) جنسی نوعیت کی چھینٹا کشی۔

(2) جو کوئی ذیلی دفعہ (1) کے فقرہ (i) یا فقرہ (ii) یا فقرہ (iii) میں مصرحہ کسی جرم کا ارتکاب کرتا ہے تو اسے 3 سال تک کی قید با مشقت کی سزا یا سزائے جرمانہ یا دونوں سزائیں دی جائیں گی۔

(3) جو کوئی ذیلی دفعہ (1) کے فقرہ (iv) میں مصرحہ کسی جرم کا ارتکاب کرتا ہے تو اسے دونوں میں سے کسی بھی قسم کی ایک سال تک کی قید کی سزا یا سزائے جرمانہ یا دونوں سزائیں دی جائیں گی۔

کسی عورت کو کپڑے اتارنے یا ننگا ہونے کے لیے مجبور کرنے کی نیت سے اس پر حملہ کرنا یا جبر مجرمانہ کا استعمال کرنا

Assault or use of criminal force to woman with intent to disrobe

دفعہ **354 ب**: جو کوئی کسی عورت کو کپڑے اتارنے یا ننگا ہونے کے لیے مجبور کرنے کی نیت سے اس پر حملہ کرتا ہے یا جبر مجرمانہ کا استعمال کرتا ہے، یا ایسے فعل کی ترغیب دیتا ہے اسے دونوں میں سے کسی بھی قسم کی کم از کم 3 سال کی اور زیادہ سے زیادہ 7 سال تک کی سزائے قید دی جائے گی اور وہ جرمانہ کا بھی مستوجب ہوگا۔

شہوت نظری، جنسی حرکات یا اعضاء کے نظارے سے جنسی تسکین

Voyeurism

دفعہ **354 ج**: جو کوئی کسی ایسی عورت کا جو کسی نجی فعل میں محو ہو ایسی صورت حال میں مشاہدہ کرتا ہے یا تصویر کھینچتا ہے جس میں وہ یہ توقع کرتی ہے کہ نہ تو مرتکب اور نہ ہی اس کی ایماء پر کوئی دیگر شخص اس کا نظارہ کرے گا یا ایسی تصویر دوسروں کو بھیجتا ہے، اسے پہلے اثبات جرم کی صورت میں دونوں میں سے کسی بھی قسم کی کم از کم ایک سال کی اور زیادہ سے زیادہ 3 سال تک کی سزائے قید دی جائے گی اور وہ جرمانہ کا بھی مستوجب ہوگا اور دوسری بار یا مابعد اثبات جرم کی صورت میں اسے دونوں میں سے کسی بھی قسم کی کم از کم 3 سال کی اور زیادہ سے زیادہ 7 سال تک کی سزائے قید دی جائے گی اور وہ جرمانہ کا بھی مستوجب ہوگا۔ **(ماخوذ خواتین سے متعلق جنسی و دیگر جرائم)**

(بقیہ آئندہ)

ساحلوں کے اُس طرف

شیری نے اخبار سامنے سے سرکا دیا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ کھڑکی کی چوکھٹ کے قریب اس کے والدین کی اچھے دنوں میں اُتاری گئی ایک تصویر میں اس کے والد اپنے سے کوئی پندرہ برس بڑی بیوی کے کمر میں ہاتھ ڈالے مسکرا رہے ہیں۔ گھنگھریالے کھچڑی بالوں اور بھرے بھرے چہرے والے اس کے چالیس سالہ والد بھورے رنگے بالوں والی اس کی پچپن سالہ چاق وچوبند والدہ سے عمر میں کسی طرح کم نہیں لگ رہے تھے۔

''تمہیں پانے کے لئے شادی کی تھی میں نے۔۔ورنہ۔۔ورنہ۔۔''

پاپا سے ڈیوورس لینے کے بعد ہمیشہ ماما نے اس کے سوالوں کا یہی جواب دیا تھا اور گردن کچھ ایسے خم کی تھی جیسے سارا قصور شیری کا ہی ہو۔

''یو کڈ ہیو ایڈاپٹڈ اے چائلڈ ماما۔نو۔۔؟''

وہ بھی ماما کے ہی انداز میں گردن کو ہلکا سا جھٹکتی۔

''نو۔۔''

ماما سختی سے کہتیں۔

''یا۔۔یو کڈ ہیو اے ٹیسٹ ٹیوب بے بی۔''

ٹین ایج سے تازہ تازہ باہر آئی شیری دھیرے سے کہتی۔

''یو مائنڈ یور اون بزنس اوکے۔۔؟''

ماما سر اٹھا کر اسے سیکنڈ بھر کو حیرت سے دیکھتیں۔ پھر ہونٹ ایسے بھینچ لیتیں جس سے شیری سمجھ جاتی کہ اب ماما کچھ دیر بات نہیں کریں گی۔

مگر یہ سب کسی تناؤ بھرے ماحول میں نہیں ہوتا تھا۔ نہ ہی اس سے کوئی تناؤ پیدا ہوا کرتا۔ بس ایسے ہی گویا معلوماتی قسم کی بحث ہو رہی ہو۔

۔۔پوئر پاپا۔۔

شیری کی نظریں چوکھٹ کے پاس سے اٹھ کر باہر چلی جاتیں۔

۔۔اے وکٹم اوف فیمنزم۔۔اور اگر ان دنوں یہ دریافت۔۔یا ایجاد۔۔وٹ ایور۔۔ہوئی ہوتی تو۔۔ دِس۔۔دِس مائی ہاؤ کور فیمنسٹ مام۔۔

شیری نے سر جھکا کر دوبارہ اخبار کے اس صفحے پر نظریں مرکوز کر لیں جو کچھ دیر پہلے خاصی دیر تک اس کی نظروں کے سامنے رہا تھا۔

کیا معلوم ایسا ہوا ہو کبھی۔۔آخر کروڑوں برس بوڑھی یہ دنیا کون جانے کس کس خطے میں کتنی کتنی بار اجڑی اور بسی ہے۔ایسا ہو تو سکتا تھا نا۔۔یا۔۔میں کچھ صدی بعد دنیا میں آئی ہوتی۔۔یا آنے والے وقتوں میں کبھی ایسا ہونا ہوتا۔۔میں بہت بعد میں جنم لیتی اور۔۔ پھر۔۔کبھی اپنے پاپا کی بیٹی میں۔۔اُس وقت صرف ماما کی رہ گئی ہوتی۔۔اور پھر دوبارہ ایک نئی طرح کی یعنی اصل میں پرانی طرح کی دنیا بساتی۔۔اور مجھے اس کے صلے میں۔۔اتنی بڑی کامیابی کے بدلے۔۔ میری ان باہوں کو ٹیٹو کیا جاتا اور میرا اچیومنٹ ان پر درج ہوتا اور۔۔اور۔۔ پھر۔۔اور میرے فوسلز کسی گلیشیر میں جوں کے توں حالت میں صدیوں بعد پائے جاتے۔۔یعنی ماما کی بیٹی اور نانی کی نواسی۔۔اور پرنانی کی۔۔ (اب جو بھی تھا) کسی مہم کے دوران اگر کسی گلیشیر میں دب جاتی۔۔پھر پتہ چلتا۔۔کہ میں نے اتنا بڑا کارنامہ کیا تھا۔

کوئی غلط تو نہ ہوتا یہ۔۔ایسا ہونا ممکن بھی تو ہے۔۔

شیری اٹھ کر کھڑکی کے قریب آ گئی اور تصویر میں اپنے والد کے چہرے کو ہاتھ سے چھوا ایسے کہ والدہ کے چہرے سے انگلی تک چھو نہ سکے۔

مگر کیا معلوم مجھے ایسا کرنے دیا جاتا۔۔یا کرنے دیا جائے۔۔یا۔۔یا۔۔یا پھر ایسا کرنے کو ایک گناہ یا جرم یا بغاوت گردان کر

۔۔۔مجھے مجھے۔۔۔نہیں۔۔۔پاپا پچھلے مہینے ہاسٹل آئے تھے تو سمجھایا تھا کہ منفی خیالات دل میں نہیں لانے چاہئیں۔۔۔

۔۔۔ہے نا پاپا۔۔۔اٹ از نٹ رونگ۔۔۔تو۔۔۔؟اگر مجھے یہ موقعہ ملتا تو آپ تو جانتے ہیں نا اپنی ایڈونچرس بیٹی کو۔۔۔

شیری کہیں دور دیکھنے لگی۔

مگر پھر سچ وہی ہوا جو شیری نے تصور کیا تھا۔کہ برسا برس بیت گئے اور کسی کو وقت کی اس تیزی کا اندازہ ہی نہ ہوا۔

بنی نوع انسان وقت کے تعین کو عشروں،صدیوں اور ہزاروں سے تعبیر کر کے لاکھوں کروڑوں برس کا حساب لگا کر خوش ہو جاتا ہے۔اور وہاں کائنات میں ایسی باتیں پلک جھپکنے سے زیادہ کی اہمیت نہیں رکھتیں۔

اور پلک جھپکنے میں سینکڑوں برس بیت جاتے ہیں۔

اور پلک جھپکنے میں سینکڑوں برس بیت گئے تھے۔

شیری کا تصور سچ کے اس درجہ قریب ہو جائے گا، اس نے کبھی سوچا تک نہ تھا۔

شیری کے کانوں میں کسی پرندے کی چہچہاہٹ پڑی تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔ایک ریت کا ذرہ اس کی آنکھ میں گھس آیا۔

وہ دونوں ہاتھوں سے آنکھوں کو مسلنے لگی اور کافی دیر اس عمل میں مصروف رہنے کے بعد اس نے آنکھیں پوری طرح وا کیں۔ نیلاہٹ مائل سرمئی سے آسمان پر بنفشی رنگ اور ساخت کا ایک پرندہ اڑ رہا تھا مگر اس کی چونچ بنفشی سے کچھ کم چپٹی تھی اور سرے تک پہنچتے نوکیلی اور خمدار ہو جاتی تھی۔آسمان بھی الگ سا لگ رہا تھا، جیسے ہر چیز پر ہلکے ہلکے بادلوں کا سایہ ہو مگر پھر بھی ہر شے حسین اور روشن ہو۔اور اس پرندے کی آواز بھی بنفشی ایسی نہیں تھی کہ جیسے آرے سے کوئی لکڑی چیر رہا ہو، بلکہ بڑی سریلی تھی۔جیسے بچوں کے لئے بنائی گئی پلاسٹک کی سیٹیاں ہوتی ہیں۔شیری کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔وہ اٹھ بیٹھی۔اس نے اتنا بڑا پرندہ پہلے کبھی اتنی لمبی اڑان بھرتے نہیں دیکھا تھا۔پرندہ اڑتے اڑتے اُس کی داہنی جانب اونچے اونچے بے شمار درختوں کی طرف چلا گیا تو وہ چونک کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔سامنے دور دور تک ریت ہی ریت تھی۔اور بائیں جانب نیلا نیلا وسیع سمندر سکون سے کہیں جا رہا تھا۔اس نے سر جھکا کر خود کو دیکھا۔اس کا لباس تار تار تھا اور بدن ریت اور کیچڑ سے لت پت تھا۔یہ سب اس نے ایک سیکنڈ کے کسی حصے میں دیکھا۔اس کے حلق سے چیخ نکل گئی۔اسے یاد آیا کہ وہ سمندر کے اوپر اڑ رہی تھی جب اس کے چھوٹے سے جہاز میں تکنیکی خرابی پیدا ہو گئی تھی۔اسے جہاز کو کریش لینڈ کرنا پڑ رہا تھا۔کنارا بہت دور تھا مگر وہ اچھی تیراک تھی۔اس نے بڑی خود اعتمادی سے ایک ہی سیکنڈ میں یہ فیصلہ لیا تھا کہ وہ جہاز کا رخ کنارے کی طرف موڑ کر پانی میں کود جائے گی اور اس نے ایک سیکنڈ سے کم وقت میں ایسا ہی کیا تھا۔مگر یہ وہ ساحل ہی تھا اور نہ یہ جگہ اس کی پہچان کی۔ملبے کا بھی کوئی نام و نشان نظر نہیں آ رہا تھا۔

اس نے جلدی سے اپنی کلائی کی طرف دیکھا۔کلائی پر ایک گہرا زخم تھا اور سنہری کلائی کی نازک جلد کے اندر لگا رابطے والا آلہ چوٹ لگنے سے خراب ہو کر بند پڑا تھا۔لباس اور جسم میں کوئی ٹرانسمیٹر سلامت نہیں تھا۔مگر سر کے اندر کچھ شور سا سنائی دے رہا تھا۔شاید دماغ کے اطراف نصب آلات کام کر رہے ہوں اور اس کی ماما کو اس کے کریش اور ڈائریکشن کا پتہ چل جائے اور اسے وہ ڈھونڈ نکالیں۔

یہ سب سوچنے میں شیری کو مزید ایک سیکنڈ لگا تھا اور تیسرے سیکنڈ اس نے اپنے سامنے ایک ایسی شے دیکھی جسے دیکھ کر اس کی چیخ تک اس کے حلق میں اٹک گئی۔اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے ہونٹ داب رکھے تھے اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے سامنے دیکھ رہی تھی۔اپنی بیس سالہ زندگی میں دنیا کے سارے ممالک کا دورہ کرنے کے باوجود شیری کی نظروں سے ایسی شے کبھی نہیں گزری تھی۔اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور مارے خوف کے آنسو بہہ نکلے تھے۔وہ منہ پر ہاتھ دھرے دھیرے دھیرے سسکنے لگی۔اسے گھر کی بے تحاشا یاد آنے لگی۔

۔۔۔ماما۔۔۔میں کہاں ہوں۔۔۔آپ کہاں ہیں ماما۔۔۔یہ کیا چیز ہے۔۔۔ماما۔۔۔

اس نے آنکھیں بھینچ لیں۔اور دماغ میں خیال اٹھتے ہی شور ختم ہوا اور سب صاف سنائی دینے لگا۔

''ہم تمہیں ڈھونڈ رہے ہیں بیٹا۔۔۔جلدی تمہارے پاس ہوں گے۔۔۔''

دماغ میں ماما کی آواز گونجی۔

۔۔۔مگر میں کہاں ہوں۔۔۔ساری ڈائریکشن لوز کر چکی ہوں۔۔۔آپ لوگ نظر نہیں آ رہے۔۔۔برین کے اندر لگا کوئی ویڈیو کام نہیں کر رہا۔۔۔اور یہ۔۔۔یہ میرے سامنے کیا ہے۔۔۔

شیری نے پھر آنکھیں بھینچ کر کھولیں تو دماغ نے واپس سگنل دیا۔ اس نے سامنے کھڑی مخلوق کو ایک بار پھر بغور دیکھا۔

"تھوڑی دیر پہلے تک تمہارے آئی لنڈس کے اوپر لگے مائکرو کیمراز ڈیمج ہونے کے باوجود سامنے کا منظر کچھ دھندلا سا دے تو رہے تھے۔۔ مگر تم نے دونوں آنکھوں کو بچیوں کی طرح مسل ڈالا اور پہلے سے ہی ٹینڈر ہو چکے اور پانی سے بھرے کیمراز میں سے ایک بھی نہ بچا۔۔ تم کہیں نارتھ کی طرف گری تھیں۔۔ پلین اور تم دونوں سمندر کے اندر گرے تھے۔۔ بٹ تھینک فلی یو آر سیف۔۔ ہم آ چکے ہوتے مگر تمہاری ڈائریکشن کا کچھ پتہ نہیں چل رہا۔ تمہارے سامنے ایک ساحل تھا۔۔ ہم تمہیں ڈھونڈتے جہاں تک آئے ہیں یہ وہی ڈائریکشن ہے مگر ادھر کوئی ساحل نہیں ہے۔۔ بٹ یو ڈونٹ وری۔۔ ہم ڈھونڈ لیں گے۔ مجھے حیرت ہے کہ دنیا کا چپہ چپہ ہمارے سب کاغذی اور برقی نقشوں میں ہے۔۔ مگر یہ کون سی جگہ ہے۔۔ خیر تم فکر نہ کرو اور زیادہ مت سوچو۔۔ تمہارے مائنڈ کے ریڈار اوور لوڈ ہونے سے ہم کو نیکٹ لوز کر سکتے ہے کیونکہ جہاں تم ہو وہاں کوئی آرٹیفیشل میگنٹک فیلڈ نہیں مل رہا۔۔ کوئی ریڈیو ویوز ڈیٹیکٹ نہیں ہو رہیں اور ان کا چارج ہونا ناممکن ہو سکتا ہے۔۔ ڈونوٹ اوور برڈن یور سیلف۔۔ ہم ڈھونڈ رہے ہیں۔۔ ہیو ہم فش ٹو ایٹ۔۔ یو ہیو ٹو سروائیو۔۔ اینڈ ریمیمبر یو آر اے بریو پرسن۔۔ مچھلی پکڑتی رہو اور زندہ رہو۔۔ ہم تمہیں جلد ہی۔۔"

ماما کی آواز کچھ رک رک کر آنے لگی۔

۔۔ماما۔۔

شیری کی آواز میں آنسو گھل گئے۔

دماغ میں لگے آلے نے اداسی کی لہروں سے چھوتے ہی اپنی ریزروایزجی استعمال کروائی اور ماما کی آواز پھر ابھری۔

"۔۔ٹو بے پی۔۔ٹو۔۔یو ہیو۔۔"

ماما کی اداس بھاری آواز ڈوبی ابھری اور بات ادھوری رہ گئی اور شیری کے دماغ میں اٹھنے والی آوازیں اچانک بند ہو گئیں۔

ایسا کیوں ہوا۔۔ میں نے تو سوچا کچھ نہیں تھا جو ایزجی ختم ہو گئی۔۔

وہ سامنے ایستادہ شے پر نظریں گاڑے سوچتی رہی۔

اوہ۔۔ مگر میں تو مسلسل سوچ ہی رہی ہوں۔۔ کیا کروں۔۔ اب میں کیا کروں۔۔

ماما سے رابطہ ٹوٹتے ہی وہ اور خوف زدہ ہو گئی اور اس کا جی چاہا کہ چیخ چیخ کر روئے مگر خوف کے حملے نے اسے چیخنے بھی نہ دیا کہ یہ انجان مخلوق جانے کیا کرے گی۔

مگر انجان مخلوق نے کچھ نہ کیا۔ بس کھڑی اسے دیکھتی رہی۔ یہ مخلوق حیرت انگیز طور پر شیری سے مشابہ تھی۔ مگر حیرت انگیز طریقے سے اس سے جدا بھی تھی۔

یہ کیا ہے۔۔

شاید کہیں دیکھی ہے اس نے پہلے ایسی کوئی شے۔۔ مگر کہاں۔۔ ہاں۔۔ شاید کسی عجائب گھر میں۔۔ تین سو سال سے قائم ایک عجائب گھر میں۔۔ جہاں اس زمانے کی اور اس سے اور پہلے کی ناپید ہو چکی مخلوقات موجود ہیں۔۔ ہاں وہیں۔۔ وہیں دیکھا ہے اس نے اس مخلوق کو۔۔ اس کی حنوط شدہ شکل کو۔۔ حنوط شدہ مخلوق کے برابر اسی کا ایک بڑا مرمری مجسمہ بھی رکھا گیا ہے۔۔ سفید پتھر کے دو زینوں والے سٹینڈ پر ایستادہ۔۔ مجسمے کا قد اس سے ملتی جلتی سامنے موجود مخلوق کی طرح لمبا ہے اور اس کی دو آنکھیں اور دو دو ہاتھ پیر ہیں جن کے پنجے خاصے نمایاں ہیں۔۔ اس کے سر پر گھنے اور کچھ لمبے بال ہیں اور چہرے پر ناک کے نیچے چھوٹے چھوٹے گھنے بال ہیں۔ اس کی ٹھوڑی پر بھی گھنے اور کچھ زیادہ لمبے بال ہیں۔ جسم پر بھی چھوٹے چھوٹے بال ہیں۔ اس نے ایک پیر پہلے زینے پر رکھا ہے اور دوسرا گھٹنا موڑ کر وہ پاؤں دوسرے زینے پر رکھا ہے۔ مجسمے کے نیچے کی عبارت شیری کا دل دہلا دیتی تھی۔

"یہ ذی روح اب نہیں پایا جاتا۔ تقریباً ڈیڑھ سو سال سے بالکل ہی ناپید ہو چکی یہ پتھری مخلوق آج کی موجودہ قوم انسان کی جانی دشمن تھی جس کے تئیں اس میں حسد کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ یہ جاندار اس قوم کی ترقی میں طرح طرح سے رکاوٹیں ڈالتا اور اس کو اذیتیں دیا کرتا تھا۔ یہ جاندار جنگ و جدل میں یقین رکھتا تھا اور اس پر فخر کرتا تھا۔ اپنی خوشی کے لئے کسی بھی حد تک جا سکتا تھا۔"

یہ اس زمانے کی بات ہے جب سائنس کی ایک حیرت انگیز دریافت نے دنیا کو چونکا دیا تھا۔

شیری نے اس کی تفصیل کہیں پڑھی تھی۔ گو کہ یہ اس کا موضوع نہ تھا مگر چونکہ نصاب میں اس کی ایک خاص اہمیت تھی اس لئے سکول کے آخری

درجے تک کم از کم اس کی تعلیم ضروری تھی۔اس کے علاوہ اس موضوع میں تحقیق وتنقید،اقتصادیات اور سائنس کے مضمون کی طرح اہمیت کی حامل مانی جاتی تھی۔

حیران کن دریافت یہ تھی کہ عورت اب مرد کے تعاون کے بغیر اولاد پیدا کرسکتی تھی۔اپنے ہی جسم کے ایک خلیے کے ذریعے۔مگر اولادِ نرینہ کے لئے پھر مرد کا تعاون ہی ضروری تھا۔اس خبر سے عورت ذات کی تانیثی تنظیموں کی کچھ اہم ارکان نے ایک خفیہ منصوبہ بنایا اور ایک ایسی تنظیم تشکیل دی جس کی ہر رکن کے پاس ایک ایسا تجربہ ہونا لازمی تھا جسے وہ وقتِ ضرورت عام کر کے اپنے مشن میں کامیابی حاصل کرسکے۔اس تنظیم میں بڑے اہم نام تھے۔جو بعد کو صدیوں تک زبان زدرہے تھے۔

پہلا نام قارا تاز کا تھا۔اس نے ساری عمر مردوں سے نفرت کی تھی اور ان کے خلاف لکھی اپنی کتابوں میں انہیں بیوقوف ثابت کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی مگر پچپن سال کی عمر میں اپنے سے بیس سال کم عمر کے مرد سے شادی کرلی۔پھر اُسے ایک نوعمر لڑکی سے عشق میں جتلا دیکھ کر گوشہ نشین ہوگئی۔شرمندہ سی قارہ تاز نے تنظیم میں شامل ہونے کے لئے فوراً ہاں کرلی تھی۔

"اور پانچویں رکن سوشل سائنٹسٹ ریزایَر نے میڈیا کے ذریعے کئی ٹھوس تجربے عام کر کے یہ ثابت کرنے میں کوئی کسر باقی نہ رکھی کہ جنگ اور خونریزی کا واحد ذمہ دار مرد ہے جو لالچ یا انا کی تسکین کے لئے کسی ملک پر بم برسا سکتا ہے۔اور یہ کہ لڑکے ہی بڑے ہو کر تشدد کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔اور بچپن سے ہی پُر تشدد کھیلوں کو اپنا کر خوش ہوتے ہیں۔اگر ان میں کوئی اتفاق سے عورت جیسا دل لے کر پیدا ہوتا بھی ہے تو وہ بھی اکثر حالات میں باقی برے مردوں کا اثر لے لیتا ہے اور ان جیسا ہی بن جاتا ہے۔اس لئے اس صنف کی موجودگی کو غیر ضروری سمجھا جانا دُنیا کے منظر نامے کی موجودہ صورتِ حال کے پیشِ نظر،نہایت ضروری ہوگیا ہے کہ اسی سے انسانیت کا مستقبل محفوظ رہ سکتا ہے"

دوسری رکن کا نام کمہ ساطی تھا۔وہ کسی زمانے میں ایک فعال تانیثیت بن کر ابھرنے ہی والی تھی کہ اسے محبت ہوگئی اور شادی کر بیٹھی۔اس کے شوہر کا ایک پاؤں نقلی نکلا جو اس نے شادی سے پہلے کمہ ساطی سے چھپائے رکھا تھا۔اور کمہ ساطی اسے چھوڑ کر پھر سے فیمنسٹ گروپ میں جاملی۔وہ بھی نئے آئیڈیا کو اپنے گناہوں کا کفارہ سمجھ کر تنظیم میں شامل ہوگئی۔تنظیم میں شامل ہونے والی ایک اور اہم رکن ڈاکٹر بدنی تھی جو غیر شادی شدہ تھی اور جانے کس سبب سے خواتین کی کچھ ایسی حامی تھی کہ مرد ذات کی دشمن جانی جاتی تھی اور یہ ثابت کرنے پر تیار رہتی کہ مرد آپس میں ہی ہر طرح کی محبت کرنے میں خوش ہیں اور آئے دن یہ معاملے سامنے آتے ہیں بلکہ اب یہ معاملے اتنے عام ہیں کہ سامنے ہی رہتے ہیں۔اور یہ عورت کو اپنا دشمن خیال کرتے ہیں۔حالانکہ دیکھنے میں ڈاکٹر بدنی کسی مرد سے کم نہیں نظر آتی تھی۔اس کے میٹرنٹی اینڈ فرٹیلٹی ہوسپٹل میں ایک بھی مرد ملازم نہیں تھا۔اپنی ہم مزاج خواتین کا عملہ اسے آسانی سے مل گیا تھا۔

چوتھی رکن ایڈووکیٹ زازی رڈ نے اپنے بچپن کے ہم جماعت اور ہم پیشہ سے شادی کی تھی جو اسے بہت چاہتا تھا مگر اس کی ذہانت سے عدم تحفظ کا شکار ہو کر اسے بہانے بہانے سے بہت مارتا بھی تھا۔زازی رڈ نے اس سے رشتہ توڑ لیا۔اور میڈیا کے ذریعے عورتوں پر بالواسطہ یا بلا واسطہ تشدد کے خلاف مہم چلائی تھی۔

اور پانچویں رکن سوشل سائنٹسٹ ریزایَر نے میڈیا کے ذریعے کئی ٹھوس تجربے عام کر کے یہ ثابت کرنے میں کوئی کسر باقی نہ رکھی کہ جنگ اور خونریزی کا واحد ذمہ دار مرد ہے جو لالچ یا انا کی تسکین کے لئے کسی ملک پر بم برسا سکتا ہے۔اور یہ کہ لڑکے ہی بڑے ہو کر تشدد کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔اور بچپن سے ہی پُر تشدد کھیلوں کو اپنا کر خوش ہوتے ہیں۔اگر ان میں کوئی اتفاق سے عورت جیسا دل لے کر پیدا ہوتا بھی ہے تو وہ بھی اکثر حالات میں باقی برے مردوں کا اثر لے لیتا ہے اور ان جیسا ہی بن جاتا ہے۔اس لئے اس صنف کی موجودگی کو غیر ضروری سمجھا جانا دُنیا کے منظر نامے کی موجودہ صورتِ حال کے پیشِ نظر،نہایت ضروری ہوگیا ہے کہ اسی سے انسانیت کا مستقبل محفوظ رہ سکتا ہے۔کیونکہ یہ لوگ اب اور بھی کئی طریقوں سے دنیا کو نیست و نابود کرنے پر تلے ہیں۔کہیں پورے کے پورے براعظم کو ایک ہی بم سے اڑانے کے تجربوں کی کوشش میں ہیں۔اور کہیں بگ بینگ تھیوری کو ایک کھیل کی طرح مصنوعی طریقے سے کھیلنے کا منصوبہ بنا کر جس میں دنیا کے عالم وجود میں آنے کی اصل

صورت حال سے آشنا ہونے کے ان کے دیوانے شوق کی تکمیل کا کم، اور کل عالم کے نیست و نابود ہونے کا کئی درجے زیادہ خطرہ ہے کہ اب یہ سائنس کے نام پر انسانوں اور حیوانوں کو ملانے لگے ہیں۔ نئے ذی روحوں کے ڈھانچے تشکیل کرنے لگے ہیں۔

یہ لوگ دوسروں کو اپنا شکار سمجھتے ہیں۔ انہیں اپنی تفریح کا سامان سمجھتے ہیں۔ سائنس کے نام پر ان سے جیسے چاہے کھیلتے ہیں اور جیسے چاہیں گے کھیلا کریں گے۔ اب یہ کسی کے بھی جذبات اُن کی فطرت سے زیادہ کر دیں گے۔ اور کہیں ان کی اصلیت سے ان کے جسم کم بنا دیں گے۔ اب یہ تماشہ گر دنیا کو تماشاہ گاہ بنانے پر تل گئے ہیں۔ جس میں بہت سے سرمایہ دار نما سیاستدان اور بہت سے سائنسدان رہ جائیں گے اور باقی ذی روح ان کے تجربے کا خام مال، کہ ان کے جینے کی طرز اور مرنے کے اسباب کے وہی مختار ہوں گے۔

یہ ساری تقریر براہ راست برقی رابطوں کے ذریعے بیک وقت تمام ممالک میں عام کی گئی۔

ایسی باتیں عقل کو لگتی تھیں۔ اور عام اذہان کے جذبہ بغاوت کی تسکین کا سامان کرتی تھیں۔ اور اس طرح شدت پسند تنظیموں کا کام آسان بھی۔

ان سب محترماؤں نے فرداً فرداً منظم طریقے سے مسلسل دو دہائیوں تک عالم بھر میں مردوں کے خلاف مہم چلائی اور پھر سب نے ایک جگہ جمع ہو کر ایک لائیو پریس کانفرنس میں دنیا بھر کی خواتین سے اپیل کی کہ وہ مردوں کا مکمل بائیکاٹ کر دیں کہ اس صنف کی اب دنیا میں قطعی کوئی ضرورت نہیں رہی۔ اگر یہ نا پید نہ ہوئے تو پوری دنیا کو ختم کرنے سے پہلے یہ عورت ذات کو ضرور ختم کر دیں گے کہ عورت کے قدرتی تخلیق کار ہونے کے سبب اور اولاد پر مالکانہ حقوق جتاتے وقت یہ ویسے ہی عدم تحفظ کا شکار رہتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کل کو کوئی ایسی ایجاد کر دیں کہ نسل بڑھانے کے لئے انہیں ہی عورت کی ضرورت نہ پڑے۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ ان کی ہی نسل روک دی جائے۔

"وقت تیزی سے بدل رہا تھا اور خیالات بھی مگر اس کے باوجود تنظیم کی ان پانچ اراکین کی حیات میں مردم شماری میں مردوں اور عورتوں کے تناسب میں کچھ نمایاں تبدیلی محسوس نہ ہوئی۔ لیکن دنیا کے ہر کونے میں ان کی ہزاروں پیروکار ضرور پیدا ہو گئی تھیں جو اس صدی کے اختتام تک لاکھوں میں بدلتی گئیں اور پھر مردوں کی گنتی میں حیرت انگیز طور پر کمی واقع ہونے لگی کہ جس رفتار سے عورتوں کی تعداد بڑھی تھی، اسی رفتار سے مردوں کی تعداد گھٹ گئی تھی"

ایسی باتوں کا اثر عورتوں کی نفسیات پر ہوتا دکھائی دے رہا تھا جس کا ثبوت میڈیا کے ذریعے سوال جواب یا لائیو مباحثے تھا۔ اور اگلے دن اخباروں میں اس پریس کانفرنس کے خوب چرچے تھے کہ ہر شعبے میں خواتین کی ایک خاصی تعداد موجود تھی جن میں ان کی ہم خیال خواتین بھی اچھی خاصی تھیں جنہوں نے اس معاملے کی ہر طرح تشہیر کی۔

وقت تیزی سے بدل رہا تھا اور خیالات بھی مگر اس کے باوجود تنظیم کی ان پانچ اراکین کی حیات میں مردم شماری میں مردوں اور عورتوں کے تناسب میں کچھ نمایاں تبدیلی محسوس نہ ہوئی۔ لیکن دنیا کے ہر کونے میں ان کی ہزاروں پیروکار ضرور پیدا ہو گئی تھیں جو اس صدی کے اختتام تک لاکھوں میں بدلتی گئیں اور پھر مردوں کی گنتی میں حیرت انگیز طور پر کمی واقع ہونے لگی کہ جس رفتار سے عورتوں کی تعداد بڑھی تھی، اسی رفتار سے مردوں کی تعداد گھٹ گئی تھی۔ گو کہ کہیں کہیں کچھ فکر مند سائنسدانوں نے کچھ "وائی" کروموزوم، محفوظ کر لئے تھے اور وہ اپنی زندگی جی کر اور مستقبل کے لئے بھی کچھ حفاظتی اقدامات کر کے ہی دنیا سے گئے تھے۔ مگر مخالفین کا غلبہ ایسا تھا کہ تعداد گھٹتی ہی گئی اور اس سے اگلی صدی کے اختتام تک دنیا ایسی بدلی کہ اطفال میں سب بچیاں ہی تھیں اور مرد ذات کا کہیں نام و نشان تک پایا نہیں جاتا تھا۔ آرکائیوز میں سے ایسی فلمیں تک ضائع کر دی گئیں جن میں محبتوں کا ذکر تھا۔ اور وہ بھی جن میں جنگ و جدل کے قصے تھے کہ گھروں سے ویسی ہی تصاویر اور نشانیاں مٹ گئی تھیں کہ تیسری چوتھی نسل کے بعد آنکھ سے اوجھل لوگوں کے تئیں جذباتی لگاؤ کے فقدان کے سبب کوئی محفوظ نہیں رکھ پاتا ہے یادوں کو۔ اور اس کے ساتھ ہی مثبت سائنسی رجحان اور نئی ٹیکنالوجی سے ممالک خود کفیل تھے اور جنگیں نہیں ہوتی تھیں۔ زمانہ اپنی رفتار سے ہمیشہ کی طرح انجان منزلوں کی جانب گامزن تھا۔

اب عجائب خانوں میں مردوں کے مجسمے اور تصاویر نظر آتیں۔ بڑی بوڑھیاں مردوں کی کہانی سنایا کرتیں جو انہوں نے اپنی بوڑھیوں سے سنی تھیں کہ ان میں سے کسی نے مرد ذات کو نہیں دیکھا تھا۔

شیری کی نانی نے بھی اپنی نانی سے سنی تھی کہ اس نانی نے اس کی اپنی نانی کے حوالے سے سنی تھی۔ اور سینہ در سینہ چل رہی داستانیں بڑی خوفناک اور دلچسپ ہوا کرتی۔ اونگھ رہی بچیاں ڈر کر دبکنے لگتیں مگر تجسس کے مارے پھر سر نکال کر پوچھتیں کہ نانی پھر کیا ہوتا تھا۔

شیری بھی پوچھا کرتی تھی۔ اور نانی پھر اپنی نانی کی نانی کی اطلاعات کے مطابق کہتیں کہ اس کی نانی نے کیا سنا تھا۔

''وہ بالکل ہمارے جیسے نظر آتے تھے۔ مگر ہم سے کچھ بڑے ہوتے تھے۔ اور ہم جیسی سب کی سوچ کو کچلنے پر تیار اور جسم کو نگلنے پر آمادہ۔۔ ہم لوگوں کو پریشان کرنا اپنا حق سمجھتے تھے۔۔''

نئی ایجادات اور مصنوعات سے صحت مند نظر آنے والی نانی کہیں سے روایتی نانی ایسی نہ تھیں۔ ماسوائے اس کے کہ ممتا کی فطری روایت سائنس کی ترقی کے باوجود بدلی نہیں جاسکی تھی۔ نانی ٹیلی وژن کی سکرین جیسی کسی شے پر نظریں جماتیں ہوئی جمائی لیتیں۔

''پھر۔۔؟''

شیری ان کے چہرے پر اپنی ملائم انگلیاں رکھ کر ان کا منہ اپنی طرف موڑتی۔

''اور کیا کرتے تھے نانی۔۔؟''

''ہم لوگوں کو تکلیف دیتے تھے۔۔ عجیب عجیب طرح سے۔۔ ذہنی اور جسمانی۔۔ اور ہاں ان کی ناک کے نیچے بال اگتے تھے۔ جنہیں ان میں سے اکثر بڑھا کر بڑے سٹائل سے تراشا کرتے تھے اور یہ بال کھاتے پیتے ان کے منہ میں گھس جاتے تھے۔''

''اوہ۔۔ چھی۔۔ گندے۔۔''

شیری اپنی ناک پر انگلی رکھ کر سر ہلاتی۔

''ان کی آواز بالکل الگ تھی۔۔ شیر کی دھاڑ جیسی۔۔ اور ہنسی ایسی کہ جیسے سمندر طوفان کے وقت چنگھاڑتا ہے۔۔ بس یہ سمجھو کہ وہ کہیں سے انسان نہیں تھے، بھلے ہی انسان سے نظر آتے ہوں۔۔''

اس دن نانی ماں بات کرتے، گاہے گاہے ٹیلیوژن جیسی چیز پر نظر ڈالتے اونگھ گئیں تھیں۔ اور شیری سوچوں میں کھوئی جاگتی رہی تھی۔

اس وقت انجان ساحل پر کھڑی پھٹی آنکھوں سے سامنے ایستادہ مخلوق کو ہونٹوں پر ہاتھ دھرے دیکھتی شیری نے جھرجھری سی لی۔

اب تک وہ خاموش اسے دیکھتا رہا تھا۔ پھر اس کے ہونٹوں پر بائیں جانب ایک خم سا نمودار ہوا جسے دیکھتے ہی شیری ایک قدم پیچھے ہٹی۔

اس شے کے ہونٹوں کے نیچے بھی گھنے گھنے سیاہ بال ہیں اور اس کا قد شیری سے لمبا ہے اور شانے چوڑے ہیں۔ اس کی ٹھوڑی پر بھی گھنے گھنے بال ہیں۔ اس کی آنکھیں کیسی کالی کالی ہیں۔ چمکیلی سی (نانی نے یہ کبھی نہیں بتایا تھا)۔ اور اس کے ہونٹ کا خم۔۔ مسکراہٹ پر مائل سا نظر آنے والا خم۔۔ کیسا جاذب سا ہے (جب کہ قاعدے سے ایسا ہونا نہیں چاہئے)۔ اس کی کسی ساتھی کی مسکراہٹ ایسی نہیں تھی۔ اور نہ گھر میں کسی کی۔۔ تو یہ ہی ہے مرد۔۔ مگر کون جانے بلا سبب پرکشش نظر آنے والا یہ خم، غصے میں آنے اور حملہ کرنے کا پہلا قدم ہو۔

جانے اب وہ اس پر کس طرح حملہ آور ہونے والا ہوگا۔

اس خیال کے آتے ہی شیری اپنا توازن کھو کر پھر ریت اور کیچڑ میں گر گئی۔ مرد پر اس کی نظریں جمی رہیں۔

اب۔۔ اب یہ شیر کی طرح دھاڑے گا اور اسے اذیت دے گا۔۔ اسے وہاں سے بھاگ جانا چاہئے۔۔ کہیں بھی۔۔ بھلے ہی واپس پانی کے اندر۔۔

شیری حملے کا اندازہ لگانے کے لئے اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ مرد اسے دیکھتا رہا اور مسکرا دیا۔ پھر اس نے جھک کر اپنا ہاتھ شیری کی طرف بڑھایا کہ وہ اس کے ہاتھ کے سہارے اٹھ سکے۔ شیری نے اس کا ہاتھ نہیں تھاما اور سر اوپر کئے اسے دیکھتی رہی۔ کئی لمحے جب وہ اس کے اٹھنے کے انتظار میں جھکا رہا اور وہ نہیں اٹھی تو یکلخت اس نے اس کا بازو پکڑ کر اوپر اٹھا لیا۔ شیری کے ہونٹوں سے گھٹی گھٹی سی چیخ نکلی تو مرد مسکراتے ہوئے کچھ بولا بھی تھا۔ شیری کی گھبرائی نظروں میں حیرت شامل ہوگئی۔ اس کی آواز شیر کی دھاڑ جیسی نہیں تھی۔ برستی ہوئی بارش جیسی لگی تھی۔ اور جب اس نے اس کا بازو پکڑ کر اٹھایا تھا تو اس کی گرفت بھی کسی پنجے یا شکنجے سی نہیں تھی بلکہ ایسی ہی دوستانہ تھی جیسی نانی اور اس کی ماما دونوں نے اسے تھام رکھا ہو۔ یا جیسے انسٹیٹیوٹ میں ساتھیوں کی تھی۔ مگر اکثر اس کے ساتھ رہنے والی کچھ بھاری جثے کی ساتا جیسی کہیں سے نہ تھی۔ ساتا کی دبلی انگلیاں اس کے بازو میں پیوست سی ہو جاتیں تھی۔ مگر مرد کے ہاتھوں کی انگلیوں کی مضبوطی کے سہارے اٹھتے وقت شیری کی ذرا بھی طاقت نہیں لگی تھی۔

شیری کی نانی نے بھی اپنی نانی سے سنی تھی کہ اس نانی نے اس کی اپنی نانی کے حوالے سے سنی تھی۔ اور سینہ در سینہ چل رہی داستانیں بڑی خوفناک اور دلچسپ ہوا کرتی۔ اونگھ رہی بچیاں ڈر کر دبکنے لگتیں مگر تجسس کے مارے پھر سر نکال کر پوچھتیں کہ نانی پھر کیا ہوتا تھا۔

شیری بھی پوچھا کرتی تھی۔ اور نانی پھر اپنی نانی کی نانی کی اطلاعات کے مطابق کہتیں کہ اس کی نانی نے کیا سنا تھا۔

''وہ بالکل ہمارے جیسے نظر آتے تھے۔ مگر ہم سے کچھ بڑے ہوتے تھے۔ اور ہم جیسی سب کی سوچ کو کچلنے پر تیار اور جسم کو نگلنے پر آمادہ۔۔ ہم لوگوں کو پریشان کرنا اپنا حق سمجھتے تھے۔۔''

نئی ایجادات اور مصنوعات سے صحت مند نظر آنے والی نانی کہیں سے روایتی نانی ایسی نہ تھیں۔ ماسوائے اس کے کہ ممتا کی فطری روایت سائنس کی ترقی کے باوجود بدلی نہیں جا سکی تھی۔ نانی ٹیلی وژن کی سکرین جیسی کسی شے پر نظریں جماتیں ہوئی جمائی لیتیں۔

''پھر۔۔؟''

شیری ان کے چہرے پر اپنی ملائم انگلیاں رکھ کر ان کا منہ اپنی طرف موڑتی۔

''اور کیا کرتے تھے نانی۔۔؟''

''ہم لوگوں کو تکلیف دیتے تھے۔۔ عجیب عجیب طرح سے۔۔ ذہنی اور جسمانی۔۔ اور ہاں ان کی ناک کے نیچے بال اگتے تھے۔ جنہیں ان میں سے اکثر بڑھا کر بڑے سٹائل سے تراشا کرتے تھے اور یہ بال کھاتے پیتے ان کے منہ میں گھس جاتے تھے۔

''اوہ۔۔ چھی۔۔ گندے۔۔''

شیری اپنی ناک پر انگلی رکھ کر سر ہلاتی۔

''ان کی آواز بالکل الگ تھی۔۔ شیر کی دھاڑ جیسی۔۔ اور فی ایسی کہ جیسے سمندر طوفان کے وقت چنگھاڑتا ہے۔۔ بس یہ سمجھو کہ وہ کہیں سے انسان نہیں تھے، بھلے ہی انسان سے نظر آتے ہوں۔۔''

اس دن نانی ماں بات کرتے، لگا ہے کہ ٹیلیوژن جیسی چیز پر نظر ڈالتے اونگھ گئیں تھیں۔ اور شیری سوچوں میں کھوئی جاگتی رہی تھی۔

اس وقت انجان ساحل پر کھڑی پھٹی آنکھوں سے سامنے ایستادہ مخلوق کو ہونٹوں پر ہاتھ دھرے دیکھتی شیری نے تھرتھری سی لی۔

اب تک وہ خاموش اسے دیکھتا رہا تھا۔ پھر اس کے ہونٹوں پر بائیں جانب ایک خم سا نمودار ہوا جسے دیکھتے ہی شیری ایک قدم پیچھے ہٹی۔

اس شے کے ہونٹوں کے نیچے بھی گھنے گھنے سیاہ بال ہیں اور اس کا قد شیری سے لمبا ہے اور شانے چوڑے ہیں۔ اس کی ٹھوڑی پر بھی گھنے گھنے بال ہیں۔ اس کی آنکھیں کیسی کالی کالی ہیں۔ چمکیلی سی (نانی نے یہ بھی نہیں بتایا تھا)۔ اور اس کے ہونٹ کا خم۔۔ مسکراہٹ پر مائل سا نظر آنے والا خم۔۔ کیسا جاذب سا ہے (جب کہ قاعدے سے ایسا ہونا نہیں چاہئے)۔ اس کی کسی ساتھی کی مسکراہٹ ایسی نہیں تھی۔ اور نہ گھر میں کسی کی۔۔ تو یہی ہے مرد۔۔ مگر کون جانے بلا سبب پر کشش نظر آنے والا یہ خم، غصے میں آنے اور حملہ کرنے کا پہلا قدم ہو۔

جانے اب وہ اس پر کس طرح حملہ آور ہونے والا ہوگا۔

اس خیال کے آتے ہی شیری اپنا توازن کھو کر پھر ریت اور کیچڑ میں گر گئی۔ مرد پر اس کی نظریں جمی رہیں۔

اب۔۔ اب یہ شیر کی طرح دھاڑے گا اور اسے اذیت دے گا۔۔ اسے وہاں سے بھاگ جانا چاہئے۔۔ کہیں بھی۔۔ بھلے ہی واپس پانی کے اندر۔۔

شیری حملے کا اندازہ لگانے کے لئے اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ مرد اسے دیکھتا رہا اور مسکرا دیا۔ پھر اس نے جھک کر اپنا ہاتھ شیری کی طرف بڑھایا کہ وہ اس کے ہاتھ کے سہارے اٹھ سکے۔ شیری نے اس کا ہاتھ نہیں تھاما اور سر اوپر کئے اسے دیکھتی رہی۔ کئی لمحے جب وہ اس کے اٹھنے کے انتظار میں جھکا رہا اور وہ نہیں اٹھی تو یکلخت اس نے اس کا بازو پکڑ کر اوپر اٹھا لیا۔ شیری کے ہونٹوں سے گھٹی گھٹی سی چیخ نکلی تو مرد مسکراتے ہوئے کچھ بولا بھی تھا۔ شیری کی گھبرائی نظروں میں حیرت شامل ہوگئی۔ اس کی آواز شیر کی دہاڑ جیسی نہیں تھی۔ برستی ہوئی بارش جیسی لگی تھی۔ اور جب اس نے اس کا بازو پکڑ کر اٹھایا تھا تو اس کی گرفت بھی کسی پنجے یا شکنجے سی نہیں تھی بلکہ ایسی ہی دوستانہ تھی جیسی نانی اور اس کی ماما دونوں نے اسے تھام رکھا ہو۔ یا جیسے انسٹیٹیوٹ میں ساتھیوں کی تھی۔ مگر اکثر اس کے ساتھ رہنے والی کچھ بھاری جثے کی ساتا جیسی کہیں سے نہ تھی۔ ساتا کی دبلی انگلیاں اس کے بازو میں پیوست سی ہو جاتیں تھی۔ مگر مرد کے ہاتھوں کی انگلیوں کی مضبوطی کے سہارے اٹھتے وقت شیری کی ذرا بھی طاقت نہیں لگی تھی۔

مرد حیرتوں میں ڈوبی شیری کا شانہ تھامے کچھ دور تک اسے اپنے ساتھ چلاتا رہا پھر آگے بڑھ گیا۔ شیری دو ایک پل رک کر سنسان، اجنبی اور کچھ عجب سی روشنی میں ڈوبے ریگزاروں کو دیکھا کی۔ یہ روشنی ہلکی تھی نہ تیز۔ مگر خاصی واضح تھی۔ اور آسمان بھی بہت اونچا نہ تھا۔ بلکہ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ آسمان کے بعد بھی کوئی چیز ہلکے رنگوں کے شامیانے کی طرح تنی ہے۔ شیری نے سر ہلکے سے جھٹکا اور اس کے پیچھے پیچھے زمین کی طرف دیکھتی چلنے لگی کہ وہ خطرناک معلوم نہیں ہوتا تھا اور شیری کے پاس دوسرا کوئی راستہ بھی نہ تھا۔ اُن کا رُخ جنگل کی طرف تھا۔ کچھ دیر تک آہستہ چلنے کے بعد مرد کی رفتار تیز ہوگئی۔ وہ دوڑتا تو شیری بھی دوڑنے لگتی تھی۔ دور دور تک اور کوئی نہیں تھا۔

یہ جنگل ایک دیو قامت چٹان پر تھا اور بہت سا چلنے کے بعد اچانک ایسے راستے کی اور مڑتا تھا جہاں صرف دائیں اور بائیں جانب سے سورج کی روشنی آتی تھی گویا پہاڑ کی قوی ہیکل چھت تلے ایک اور دنیا آباد تھی جو مکمل روشن تھی مگر جنگلوں کی بہتات اور کئی میلوں تک اٹھی آڑی چٹان کے سبب اوجھل بھی تھی۔ آڑی چٹان پر دیو ہیکل درختوں کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا اور یہ چٹان جیسے دونوں جانب سے تیکھے والی ٹوپیاں پہنے ایستادہ تھی اور ساحل ایسے ڈھکا تھا کہ چٹان کے نیچے سے گزرے بغیر ساحل کا نظر آنا ممکن نہ تھا۔ مگر سارے منظر میں روشنی بھی تھی اور سورج کی کرنیں بھی ادھر اُدھر رقص کرتی پھرتی تھیں۔

جس راستے سے وہ گزر رہے تھے وہ راستہ کچا تھا۔ اطراف اونچے اونچے درختوں پر پرندے ادھر اُدھر شور مچاتے پھرتے تھے۔ کچھ پرندوں کو وہ پہچانتی تھی۔ کچھ اس نے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو اس نے عجائب گھر میں عنقا ہو چکے پرندوں کی حنوط شدہ شکل میں دیکھے تھے۔ مگر سب کی بولیاں بڑی سریلی تھیں۔ کچے راستے سے نکلنے والے اور راستے پھولوں اور پھلوں سے بھرے نظر آرہے تھے۔ اب وہ کسی وادی میں آگئے تھے۔ دور دور تک پکے اناج والے سنہرے کھیت تھے۔ لکڑی اور گھاس کی گول، چکور، آڑی اور سیدھی چھتوں اور بڑے بڑے باغیچوں والے گھر تھے۔ سواری کے جانور تھے مگر گاڑی قسم کی کوئی چیز نہیں تھی۔

آگے چلتا ہوا مرد اسے پلٹ کر دیکھ لیتا تھا اور جہاں راستہ تنگ یا پانی سے بھرا ہوتو اس کے لئے جگہ چھوڑ کر رک جاتا اور اس کے گزرنے کے بعد خود گزرتا۔

کچھ دیر بعد وہ ایک بڑے سے باغ میں پہنچ گئے تھے جہاں شیری نے اپنے جیسی بہت سی لڑکیاں اور اس مرد جیسے بہت سے مردوں کے علاوہ ہر عمر کے مرد عورت دیکھے۔ یہاں عورتوں کے چہرے اس کی دنیا کی نسبت پر سکون معلوم ہوتے تھے۔ مرد نے شیری کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرکے ایک اور ہم عمر مرد سے دھیرے سے کچھ کہا۔ دھیمے لہجے میں اس کی آواز گٹار کے نچلے سروں سی معلوم ہوتی تھی۔ اس کی بات پر اس کا ساتھی قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ اس آواز پر شیری نے پھر حیرت سے دیکھا۔ قہقہہ پہاڑی جھرنے کی طرح اس کے ساتھی کی مضبوط گردن کے حلقوم سے ابھرا تھا۔ کسی جانور کے کھال سے ڈھکے اس کے چست پیٹ کے اوپر چھاتی کچھ اور پھیل گئی تھی۔ قہقہہ سن کر سوکھی گھاس کو گٹھوں میں لپیٹتی ایک لڑکی نے پلٹ کر دیکھا اور قہقہہ لگانے والے مرد کے پاس آگئی۔ مرد نے اسے بھی اپنی زبان میں کچھ کہا تو دونوں ہنس پڑے۔ اس ہنسی پر شیری مزید ایک بار چونکی کہ اس کے کان عورت اور مرد کی ملی جلی ہنسی سے نا آشنا تھے۔ اس مشترکہ ہنسی میں بانسری اور سرود کے سُر ملے ہوئے تھے۔ جیسے برسنے پر آمادہ بادلوں کی گرج کے درمیان کوئی بلبل گا رہی ہو۔ شیری کی حیرت پر اس لڑکی نے مسکرا کر مرد کی آنکھوں میں دیکھا اور اس کے چہرے کے قریب اپنا چہرہ لے جا کر کچھ بولی۔ مرد بھی مسکراتے ہوئے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کچھ کہنے لگا۔ وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ شیری نے اس طرح کا کوئی منظر پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ چرند پرند قہقہہ لگاتے ہیں نہ مسکراتے ہیں۔ جانوروں میں نر اور مادہ آپس میں باتیں ہی کرتے ہیں نہ آنکھوں میں دیکھتے ہیں۔ انسان کو قدرت نے بولنے، مسکرانے اور آنکھوں کو دل کی جگہ استعمال کرنے کی راحت عطا کی ہے۔ آج سے قبل شیری نے قدرت کے بنائے ہوئے جو جوڑے دیکھے تھے اُن سے انسانوں کا جوڑا سب سے الگ، سب سے اشرف تھا۔ سب سے مکمل اور سمجھدار معلوم ہوتا تھا کہ بات کرکے دل کی بات کہنے کی قدرت رکھتا تھا۔ شیری ہر بات کو بغور دیکھتی۔ سمجھنے کی کوشش کرتی اور اس میں کامیاب ہوتی۔ گو کہ ہر بات اس کے لئے نئی تھی۔ اور، بہت سی نئی باتیں اس کی منتظر تھیں۔

پھر مرد نے شیری کو دیکھ کر عورت سے کچھ کہا تو عورت کا چہرہ یکا یک بجھ سا گیا۔ وہ کچھ لمحے شیری کی طرف بغور دیکھتی رہی پھر اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں میں شکوہ بھر کر اپنے ساتھی کی طرف دیکھا اور پلٹ

کر واپس گھاس کے ڈھیر کی جانب چل دی ۔مرد نے مسکراتے ہوئے اسے پکارا۔اس نے مڑ کر نہیں دیکھا تو وہ بھی اس کے پیچھے گھاس کی ڈھیری کی طرف لپکا۔وہ سر جھکائے کام میں مصروف بنی رہی ۔ وہ اس کے قریب جا بیٹھا۔ پھر کبھی ہنستا اور کبھی مسکرا مسکرا کر اسے کچھ کہتا رہا۔وہ اس کی طرف سے منہ پھیر لیتی تو وہ اس کے چہرے کے رخ پر سامنے چلا جاتا۔لڑکی اسے نظر انداز کرتی رہی۔اس نے جیسے اس سے نہ بولنے کی قسم کھا رکھی تھی ۔ یہ حالت دیکھ کر مرد کچھ پل اسے سنجیدگی سے دیکھتا رہا پھر اس نے لپک کر لڑکی کو گود میں اٹھالیا اور گول گول گھومنے لگا ۔لڑکی نے مسلسل سنجیدہ صورت بنائے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کی مگر پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی اور لڑکے کے گلے میں باہیں ڈالے اس کی گود میں جھولتی رہی اور اس وقت تک ہنستی رہی جب تک وہ اسے گود میں گھماتا اس کے ساتھ ہنستا رہا۔ پھر لڑکا جب لڑکی کا بوجھ اٹھائے اٹھائے تھک گیا تو لڑکی کو گھاس کی ڈھیری پر پٹخ کر زور زور سے ہنستا وہاں سے بھاگا اور لڑکی زور سے ہنس کر ہلکے سے چلائی اور اٹھ کر اس کے پیچھے بھاگی ۔ یہاں تک کہ دونوں نظروں سے اوجھل ہو گئے ۔شیری کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ناچ رہی تھی اور اسے یاد ہی نہ تھا کہ وہ گھر میں نہیں ہے بلکہ بھٹک کر کسی اور ہی دنیا میں پہنچ گئی ہے ۔ایسا منظر بھی شیری نے کبھی دیکھا تھا نہ تصور کیا تھا۔ان دونوں کے نظروں سے اوجھل ہوتے ہی شیری نے محسوس کیا کہ وہ بڑی دیر سے مسکرا رہی ہے اور ساحل سے ساتھ آنے والا لڑکا ہونٹوں کو بائیں جانب خم سا دیئے گویا مسکراہٹ پر آمادہ اسے دیکھ رہا ہے۔ شیری کی اس پر نظر پڑتے ہی وہ مسکرا دیا۔ اور اسے دیکھتا رہا۔ایسے ہی جیسے کچھ دیر پہلے گھاس لپیٹنے والی لڑکی کو اس کا ساتھی دیکھ رہا تھا۔شیری بھی اسے دیکھتی رہی ۔ اس کا دل اس کے چہرے سے نظریں ہٹانے کو نہ چاہتا تھا اور وہ جیسے بے بس سی اس کی گھورتی ہوئی آنکھوں کو دیکھتی جا رہی تھی ۔مگر شیری کو اس بے بسی کا کوئی غم نہ تھا۔

یہ کیسی بے بسی ہے۔۔

اسے اس مجبوری سے ایسی راحت کیوں مل رہی ہے۔۔

یہ دل کے اندر کوئی راگ سا کیا چھڑ گیا ہے۔۔

یہ روح اتنی پُرسکون کیسے ہوگئی ہے۔۔

یہ زندگی اتنی آسان سی کیسے لگ رہی ہے۔۔

اور۔۔اور۔۔ یہ زندگی اس کی زندگی سے کتنی بہتر ہے۔۔کتنی اصلی اور کیسی فطری ہے۔۔

اس لڑکے کی آنکھوں نے اس کی آنکھوں تک یہ کیسا سلسلہ سا باندھ دیا جسے توڑنے کی اس میں ہمت ہی نہیں۔۔

اور جب۔۔ جب ساتا اسے دیکھتی تھی تو۔۔

شیری کے چہرے پر سنجیدگی سی چھانے لگی تھی اور ساتا کے دیکھنے کے خیال سے اسے عجیب سی بیزاری کا خیال آیا اور پھر گھن سی آنے ہی لگی تھی کہ اس نے فوراً لڑکے سے نظر ملنے کے احساس کو دوبارہ خود پر حاوی کیا اور مسکرا اٹھی۔

وہ کتنی خوش نصیب ہے کہ اس نے زندگی کی اصل صورت دیکھ لی

۔۔

وہ کسی جادوئی طاقت کے زیر اثر لڑکے کو دیکھتی رہی ۔ یہاں تک کہ کچھ بچے کسی جانب سے دوڑتے ہوئے آئے اور ان کے پیچھے ایک ادھیڑ عمر عورت ۔ اس عورت نے دلچسپی سے شیری کو دیکھا اور بچوں سے کچھ کہا۔ان کے پیچھے ایک سفید ڈاڑھی والا بزرگ سا آدمی ایک بچے کو گردن پر بٹھائے آ رہا تھا۔ اور ان کے پیچھے ایک نوجوان جوڑا۔

بچے ادھر ادھر دوڑتے پھرتے کھیلنے لگے اور ایک بہت چھوٹا سا ننگ دھڑنگ بچہ شیری کی طرف دوڑا اور آدھے راستے میں رک کر اسے دیکھ کر شرماتا سا ٹھہر گیا اور پھر کچھ پل بعد مسکرا دیا تو شیری کو ہنسی آ گئی ۔وہ اسے غور سے دیکھتی مسکراتی رہی کہ بچے بھی بچیوں کی طرح معصوم ہوتے ہیں اور ویسے ہی پیار کرنے اور پیار چاہنے والے بھی۔

تو جو اس نے آج تک پڑھا، سنا، جانا، سمجھا، سب جھوٹ تھا ۔۔سب غیر فطری اور غلط تھا۔۔

شیری کے چہرے پر تناؤ ابھر آیا۔۔ اس نے سر جھٹک کر دوسری طرف دیکھا۔

اور۔۔اور گھناؤنا بھی۔۔اس کی نظروں میں ساتا کا سراپا گھوم گیا ۔اسے عجیب سی کراہیت کا احساس ہوا۔

ایسی مثال درندو چرند میں کیا، پرند و حشرات الارض میں بھی نہیں مل سکتی کہ جسمانی ساخت میں بالکل اپنی ہی صنف سے مخالف صنف کا سا غیر فطری طور پر اپنایا گیا فعل۔۔محض کسی بیمار تجسس کی تسکین کے لئے ۔۔غیر متوازن نفسیات کے جنونی غلبے میں خود کو بے قابو ہو جانے دے کر ۔۔اپنے غلط عمل کو صحیح ثابت کرنے کی ناکام کوشش میں دوسروں کو ان

عادات کا شریک بنانے کا صدیوں پر محیط مسلسل عمل اور معصومیت کا استحصال ۔۔اور پھر ایسے ذہنی مرض کو فطری ظاہر کرنے کے لئے احتجاجات بھی اور ہم خیالوں سے ان رجحانات کے تحفظ کی سند بھی ۔۔ جبکہ فطرت نے انسان کو مکمل بنایا۔۔ ہر ذی روح کی طرح ۔۔ ایک جوڑے کی صورت ۔۔ ایک منطق کے تحت۔۔

ادھیڑ عمر عورت نے شیری کو سوچوں میں گم دیکھا تو قریب آ گئی اور سر کے اشارے سے ساتھ چلنے کو کہا۔ شیری پلٹ پلٹ کر ساحل والے لڑکے کو دیکھنے لگی تو عورت نے اپنی زبان میں لڑکے سے کچھ کہا۔ چھوٹا سا وہ گھر بڑا پرسکون تھا۔ جہاں شیری نے تازہ دم ہو کر نوجوان کے ساتھ پھلوں کا ناشتہ کیا تھا۔ اور کوئی شربت پیا تھا۔ شیری ایسی پرسکون تھی جیسے اس کا جہاز ڈوبا ہی نہ۔ ایسی مطمئن تھی جیسے وہ گھر سے دور ہو کر گم ہی نہ ہوئی ہو۔ ایسے خوش تھی جیسے خوشی اس نے پہلی بار محسوس کی ہو اور ایسے خاموش تھی جیسے کچھ حاصل کرنے کو باقی نہ رہا ہو اور زندگی اس نوجوان کے ہمراہ رہ جانے کا نام ہو۔

اور وہ وہیں رہ گئی۔ اپنی تہذیب یافتہ دنیا سے کہیں زیادہ مہذب اور بچی دنیا میں۔ جہاں تک مشینوں اور مشینی خیالات کی رسائی نے انسانوں اور فضا کو آلودہ نہیں کیا تھا۔ دنیا کا یہ اوجھل حصہ برباد ہونے سے بچ گیا تھا۔ شیری نے ان کی زبان سیکھ لی اور ان میں رچ بس کر اس ماحول کا حصہ ہو گئی۔

"وہ ایک دلفریب شام تھی جب اس نے دیکھا کہ سمندر نے اس کا جہاز اگل دیا ہے۔ خوش ہونے کی بجائے اس پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا کہ جہاز میں لگے آلات کی مدد سے اسے ڈھونڈ نکالا جاسکتا تھا۔ اور وہ شدت غم سے خود کلامی سی کرنے لگی تو اس کے ساتھی نے اس کا سر اپنی چھاتی سے لگا لیا۔ اب ۔۔ اب ۔۔ اس کی مسرتیں اس سے چھین لی جاسکتی ہیں ۔۔ شیری نے جھرجھری سی لی اور ۔۔ اور اس مقام کی معصومیت نوچ لی جاسکتی ہے۔ شیری کا چہرہ پیلا سا پڑ گیا ۔۔"

کئی مہینے بعد جب اس کے اندر اس کے ساحل والے ساتھی کا بچہ ننھے ننھے ہلکوروں سے اپنے ہونے کا احساس دلانے لگا تو وہ اپنے ساتھی کا ہاتھ تھامے سرشاری کے عالم میں اس مقام کی طرف نکل آیا کرتی جہاں زندگی سے اس کی ملاقات ہوئی تھی۔

وہ ایک دلفریب شام تھی جب اس نے دیکھا کہ سمندر نے اس کا جہاز اگل دیا ہے۔ خوش ہونے کی بجائے اس پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا کہ جہاز میں لگے آلات کی مدد سے اسے ڈھونڈ نکالا جاسکتا تھا۔ اور وہ شدت غم سے خود کلامی سی کرنے لگی تو اس کے ساتھی نے اس کا سر اپنی چھاتی سے لگا لیا۔

اب ۔۔ اب ۔۔ اس کی مسرتیں اس سے چھین لی جاسکتی ہیں ۔۔ شیری نے جھرجھری سی لی۔

اور ۔۔ اور اس مقام کی معصومیت نوچ لی جاسکتی ہے۔ شیری کا چہرہ پیلا سا پڑ گیا۔

اس کی دنیا تہہ و بالا ہو سکتی ہے ۔۔ اور وہ اگر اپنے ساتھی کو اپنے ہمراہ لے جائے تو کون جانے اس کے ساتھ کیا سلوک ۔۔ اس کے ساتھی کی زندگی کو خطرہ ہو سکتا ہے ۔۔

شیری ایک چیخ مار کر بے خود سی ہو گئی۔ اس کے ساتھی نے اس کا سر اپنی گود میں لے لیا۔ اور اس کا ماتھا سہلاتا رہا۔ شیری نے آنکھیں کھولیں اور جہاز کی طرف گردن موڑی۔ پھر کچھ لمحوں بعد اٹھ کر جہاز کے قریب چلی گئی۔

جہاز میں بہت زیادہ خرابی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ جہاز کو کیسے ٹھیک کیا جاسکتا ہے۔ وہ سگنل ریسیو کر رہا تھا۔ بس چند ایک بٹن دبانے کی دیر تھی جس کے بعد اس کا اپنی دنیا سے رابطہ ہو سکتا تھا۔ اور شیری یہ بھی جانتی تھی کہ سگنلز ہمیشہ کے لئے کیسے بند ہو سکتے ہیں۔

اس نے نظر گھما کر نوجوان کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف کے سائے سے لہرا رہے تھے۔ تکنیکی دنیا کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتا تھا اور اس بات کے علاوہ کچھ نہیں سمجھتا تھا کہ اس کے بچے کی ماں اس کے پاس ہے اور وہ دور بھی ہو سکتی ہے۔ اس نے شیری کے شانوں کو ہاتھوں سے تھام لیا۔ اس کی باہوں میں شیری کے مستقبل کا تحفظ تھا۔ اس کی گہری گہری آنکھوں میں وعدے تھے۔ اس کے چہرے پر دکھ اور سکھ بانٹنے کا عزم تھا۔ پریشان سی پیشانی پر ابھری لکیروں کے اوپر اس کے لہراتے بال اسے مزید حسن بخش رہے تھے۔ لانبی لانبی انگلیوں والے اس کے ہاتھ اسی لئے بنے تھے کہ شیری کے کندھوں کو تھام سکیں۔ اس کے بازوؤں کی مچھلیاں اسی لئے ابھری ہوئی تھیں کہ شیری کی کمر کو سہارا دے سکیں۔

شیری کی آنکھیں بھر آئیں۔اس نے نوجوان کے کھردرے رخسار کو اپنی نرم انگلیوں سے چھوا اور ایک گہرا سانس لیا۔

یہ راحتیں اس سے چھن سکتی ہیں۔۔اور وہ کبھی کسی کو ان راحتوں کے بارے میں سمجھا نہیں سکے گی۔۔اور۔۔اور ایسی راحتوں سے اس جیسی سوچ رکھنے والی لڑکیاں محروم رہیں گی۔۔ہمیشہ۔۔ہمیشہ۔۔

شیری نے پلٹ کر شکستہ جہاز کو دیکھا۔

اگر وہ کسی طرح ماما کو اپنا ہم خیال بنالے تو ایک نئی دنیا کی بنیاد پڑ سکتی ہے۔۔آنے والی نسلیں مکمل پیدا ہو سکتی ہیں۔۔اور آنے والی نسلوں کی تکمیل کی خاطر اسے۔۔اسے۔۔دو جہاں کی فکروں میں غلطاں اس وجیہہ پیشانی سے بچھڑنے کا خطرہ مول لینا ہوگا۔۔

شیری نے جہاز سے نظریں ہٹا کر مرد کے چہرے کی طرف دیکھا پھر اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر آہستگی سے اپنے پیٹ کے اطراف رکھ دیے۔اور پھر اس کے سینے پر اپنا سر رکھ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔جانے کتنی دیر وہ روتی رہی کہ اچانک اسے محسوس ہوا کہ اس نے ماما کی آواز سنی ہو۔

''اگر وہ کسی طرح ماما کو اپنا ہم خیال بنالے تو ایک نئی دنیا کی بنیاد پڑ سکتی ہے۔۔آنے والی نسلیں مکمل پیدا ہو سکتی ہیں۔۔اور آنے والی نسلوں کی تکمیل کی خاطر اسے۔۔اسے۔۔دو جہاں کی فکروں میں غلطاں اس وجیہہ پیشانی سے بچھڑنے کا خطرہ مول لینا ہوگا۔۔''

''اچھا ہوا۔۔اب مجھے گرینی بننے کے لئے کسی ٹام ،ڈک اینڈ ہیری کی ضرورت نہیں پڑے گی۔تم اکیلے مجھے نانی بنا سکتی ہو۔یو کین بی کم اے مام آن یور اون ،بے بی۔۔''

اس کے کانوں نے سنا تو وہ گھبرا گئی۔اس کے پیٹ میں فطرت کے اصولوں سے الگ کوئی بچہ نہیں ہوگا۔۔کبھی نہیں۔۔اس نے چلا کر کہنا چاہا تو دیکھا کہ اس کی ماما تازہ اخبار کے سائنس والے صفحے کے اسی کالم کو بغور پڑھ رہی ہیں جسے شیری نے کچھ دیر پہلے پڑھا تھا۔اور اخبار، جون سن پچیس سو سات کا نہیں، جون سن دو ہزار سات کا تھا۔اس نے اپنے صندلیں سے پیٹ پر انگلیاں گھمائیں۔اس میں کوئی بچہ تھا نہ اس کی کمر کے گرد کسی حسین نوجوان کی باہیں۔اس انکشاف سے اس کے ہونٹوں پر پُرسکون ہنسی ابھری اور غائب ہوگئی۔اس نے پلٹ کر کھڑکی کی چوکھٹ کے قریب لگی تصویر کی جانب نظر ڈالی۔

''آئی لو یو پاپا۔۔''

وہ تصویر کے قریب چلی گئی اور کچھ اونچی آواز میں بولی۔

''آئی ہیٹ ہم۔۔او کے؟نفرت ہے مجھے اس سے۔۔''

ماما نے بھی ذرا اونچی آواز میں کہا۔

''وائی۔۔ماما۔۔؟''

نن آف یور بزنیس۔۔''

''نو مام۔۔اٹ از مائی بزنیس۔۔''

''تم کیا جانو صدیوں سے عورت نے کتنا سہا ہے۔۔''

''ہوسکتا ہے اس سے پہلے مردوں نے سہا ہو۔۔یا اس کے بعد سہنے والے ہوں۔۔خوامخواہ۔۔''

''فضول کی بحث مت کرو۔۔تم جانتیں ہی نہیں ہماری حیثیت کیا تھی۔۔ترقی اور تہذیب پر فخر کرنے کے باوجود ہمیں کس کس طرح محروم رکھا گیا۔۔شروعات میں ووٹ تک کا حق لینے میں ہمیں صدی بھر کا وقت لگا تھا۔۔سب سے پہلے اٹھنے والی تانیثی آوازوں کو یورپ اور امریکہ جیسی جگہ میں دہائیوں جدوجہد سے ریکویسٹ کرنا پڑی تھی۔۔پھر ساری دنیا میں پھیلا ہمارا موومنٹ۔۔یا ساتھ ساتھ اپنے انداز میں دنیا بھر میں چلتا رہا۔۔چل رہا ہے۔۔یا چل رہا ہوگا۔۔''

''او کے۔۔بٹ پاپا۔۔''

''یور پاپا۔۔مائی فٹ۔۔وہ بھی ویسا ہی نکلا تمہارا باپ۔۔اسکیپر۔۔اے ٹپیکل میل شاونسٹ۔۔''

''او کے۔۔اب ماما۔۔آپ لاگوں نے اپنے حقوق حاصل کر لئے نا۔۔آپ اپنی ہر مانگ قانوناً پوری کرا سکتی ہیں۔۔اب میں۔۔''

شیری نے لمحے بھر کے لئے ماں کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔پھر اٹھ کر کھڑکی کے قریب چلی گئی۔

''تو پھر مجھے بھی ماما۔۔ایک موومنٹ شروع کرنا پڑے گی۔۔اینٹی فیمینسٹ موومنٹ۔۔آئی لو بوتھ آف یو۔۔''

۔اس نے چوکھٹ کے قریب لگی تصویر کے کانچ پر اپنی نرم نرم انگلیوں سے پاپا اور ماما کے چہروں کو چھوا پھر پلٹ کر ماں کی طرف دیکھا اور مسکرا دی۔

عمارت

نگار عظیم

پھولوں سے لدی بگن ولا کی بیلوں نے دیوار میں نصب نیم پلیٹ کو تقریباً ڈھک لیا تھا۔ میں نے ذرا جھک کر نیم پلیٹ پڑھنے کی کوشش کی۔ کرنل قیصر بیگ C-11۔ پھر میں نے اپنی فہرست میں درج نام کی تصدیق کرتے ہوئے کال بیل پر انگلی رکھ دی اور کچھ فاصلے سے کھڑے ہو کر آنے والے کا انتظار کرنے لگی۔ خود بہ خود میری نظریں کوٹھی کی باہری صورتِ حال کا جائزہ لینے لگیں۔ کوٹھی پرانے طرز کی تھی۔ خاص دروازے کے دونوں طرف نقشیں قمقمے نصب تھے۔ باؤنڈری کی دیوار پہ یکساں فاصلے سے تقریباً تین فٹ اونچی محرابیں بنی تھیں اور ان کے سرے پر قندیلیں نصب تھیں۔ میں سوچنے لگی سب ایک ساتھ جلتی ہوں گی تو کتنا چراغاں ہوتا ہوگا۔ میں اس کوٹھی کے مکینوں کے بارے میں سوچ ہی رہی تھی کہ گیٹ کے درمیان لگی کھڑکی کھول کر ایک دُبلا پتلا درمیانے قد کا شخص جھک کر باہر نکلا اور سوالیہ نظروں سے میری جانب دیکھنے لگا۔ شخص کی عمر تقریباً پچاس پچپن رہی ہوگی۔ بالوں کی سفیدی سے اندازہ ہوتا تھا کہ وقت سے پہلے ہی وہ اپنی منزل کو پہنچ چکا ہے۔ اس کی سوالیہ نظریں دیکھ کر میں نے اپنا مدعا بیان کیا۔

کرنل صاحب سے ملنا ہے۔ یہ سوچ کر کہ یہی کرنل صاحب نہ ہوں میں نے انتہائی شائستگی سے جملہ ادا کیا۔ میں مردم شماری کے لیے آئی ہوں۔"

کرنل صاحب موجود نہیں ہیں۔ آپ کو کچھ دیر انتظار کرنا پڑے گا۔

کیا بہت دیر لگے گی؟

نہیں نہیں۔ وہ بس آتے ہی ہوں گے۔

اس شخص نے پورا گیٹ کھولتے ہوئے مجھے راستہ دیا اور میں اندر داخل ہو گئی۔ چوڑی راہ داری کے دونوں اطراف بہت خوبصورت لان تھا۔ گرمی کی شدت کو جھیلنے والے تمام موسمی خوشنما پھولوں سے کیاریاں بھری ہوئی تھیں۔ گلاب کے بڑے بڑے پھولوں سے کئی شاخیں جھکی جا رہی تھیں۔ پودوں اور پھولوں کی کئی قسمیں دیکھ کر مکینوں کے ذوق کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ باٹل پام اور اشوکا کے اونچے اونچے پیڑ عمر رفتہ کا بیان کر رہے تھے۔ ایک طرف بانس کی کھپچیوں کے جال پر مالتی کی بیلوں کو چڑھا کر سایہ بنایا گیا تھا۔ سائے کے نیچے کین کی ایک میز کے اردگرد کئی کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔

بیٹھ جائیے۔ ان صاحب نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔

جی میں ٹھیک ہوں۔

"اس شخص نے پورا گیٹ کھولتے ہوئے مجھے راستہ دیا اور میں اندر داخل ہو گئی۔ چوڑی راہ داری کے دونوں اطراف بہت خوبصورت لان تھا۔ گرمی کی شدت کو جھیلنے والے تمام موسمی خوشنما پھولوں سے کیاریاں بھری ہوئی تھیں۔ گلاب کے بڑے بڑے پھولوں سے کئی شاخیں جھکی جا رہی تھیں۔ پودوں اور پھولوں کی کئی قسمیں دیکھ کر مکینوں کے ذوق کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ باٹل پام اور اشوکا کے اونچے اونچے پیڑ عمر رفتہ کا بیان کر رہے تھے۔ ایک طرف بانس کی کھپچیوں کے جال پر مالتی کی بیلوں کو چڑھا کر سایہ بنایا گیا تھا۔ سائے کے نیچے کین کی ایک میز کے اردگرد کئی کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔"

اب تک کے بیس بائیس گھروں کے سینسس کے بعد یہ پہلا گھر ایسا ملا تھا جہاں کوئی اتنی شائستہ گفتگو کر رہا تھا۔ حالانکہ یہ علاقہ پڑھے لکھے مہذب لوگوں کا ہی تھا۔ اندرونی دروازے کے باہر شیڈ کے نیچے ایک سفید گاڑی کھڑی تھی۔ کوٹھی کے احاطے کی پوری دیواریں زرد گلابی اور

سفید بکن ولا سے لدی تھیں۔ دروازہ کھولنے والا شخص کٹنگ مشین کو بڑی پھرتی سے گھاس پر چلا رہا تھا۔ مخملی سبزہ بچھتا جا رہا تھا اور ایک طرف کٹی ہوئی گھاس کا ڈھیر لگ گیا تھا۔

کیا کوئی اور نہیں ہے گھر میں؟؟ بھیا! کرنل صاحب کی بیگم بھی تو ہوں گی انہیں سے ملوا دیجئے۔ لیکن میری آواز گھاس کٹر میں کہیں گم ہوگئی۔ میں پھر پیڑ پودوں میں دلچسپی لیتے ہوئے ادھر ادھر ٹہلنے لگی... ارے ..... واہ! اچانک میری نظریں دیوار میں لگے ایک جال پر ٹک گئیں۔ جو دیوار کے سہارے ٹکا تھا یا پھر نصب تھا۔ قریب جا کر میں نے دیکھا رنگ برنگی دیسی بدیسی کئی قسم کی چڑیاں اور طوطے ادھر سے اُدھر اس سنہرے جال میں پھدک رہے تھے۔ کئی مختلف سائز کی ہانڈیوں میں ان کے گھونسلے بھی بنے تھے۔ نہانے کے لیے پانی سے بھری ناند بھی رکھی تھی۔ جال کچھ اس طرح سے فٹ کیا گیا تھا یا ہوگیا تھا کہ پیڑوں کی کئی شاخیں جال کے اندر

"ارے ..... واہ! اچانک میری نظریں دیوار میں لگے ایک جال پر ٹک گئیں۔ جو دیوار کے سہارے ٹکا تھا یا پھر نصب تھا۔ قریب جا کر میں نے دیکھا رنگ برنگی دیسی بدیسی کئی قسم کی چڑیاں اور طوطے ادھر سے اُدھر اس سنہرے جال میں پھدک رہے تھے۔ کئی مختلف سائز کی ہانڈیوں میں ان کے گھونسلے بھی بنے تھے۔ نہانے کے لیے پانی سے بھری ناند بھی رکھی تھی۔ جال کچھ اس طرح سے فٹ کیا گیا تھا یا ہوگیا تھا کہ پیڑوں کی کئی شاخیں جال کے اندر سے ہوکر گزر رہی تھیں۔ جال کی لمبائی چوڑائی تقریباً چار فٹ بائی چھ فٹ رہی ہوگی۔ اتنے لمبے چوڑے جال میں اپنے عیش و آرام کی مکمل رہائشی سہولیات سے شاید ان پرندوں کو اپنے قید ہونے کا احساس مٹ چکا تھا۔"

سے ہوکر گزر رہی تھیں۔ جال کی لمبائی چوڑائی تقریباً چار فٹ بائی چھ فٹ رہی ہوگی۔ اتنے لمبے چوڑے جال میں اپنے عیش و آرام کی مکمل رہائشی سہولیات سے شاید ان پرندوں کو اپنے قید ہونے کا احساس مٹ چکا تھا۔ وہ اپنی دنیا میں مست تھے۔ میں بڑی دلچسپی سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ کرنل صاحب کے انتظار میں بار بار میری نگاہیں خاص گیٹ کی جانب بھی اٹھ جاتیں۔ غالباً انتظار ختم ہوا۔ خاص دروازہ کھلا اور ایک بہت ہی پُر وقار وجیہہ شخص سفید کرتے پاجامے پر کالی پشاوری جوتیاں، بالوں کی سفیدی نے اس شخص کے چہرے میں بلا کی جاذبیت اور کشش پیدا کردی تھی۔

قریب آتے ہوئے انہوں نے انجنی تیز لیکن ملائمت بھری نگاہوں سے مجھے دیکھا۔

سر کو خفیف سی جنبش دے کر میں نے سلام عرض کیا۔ وہ چند سکنڈ میرے قریب رکے تو میں نے اپنا مقصد بیان کیا جناب، میں سنسز کے لیے آئی ہوں۔

اچھا۔ اچھا... ارے، خان بہادر... بٹھایا نہیں محترمہ کو۔ وہ ذرا اونچی آواز میں بولے۔

آئیے تشریف لائیے باہر سخت گرمی ہے۔

جی۔ لیکن میں اچھا محسوس کررہی تھی۔ اور پھر میں... ان کے پیچھے پیچھے اندر داخل ہوگئی۔

صوفے کے نرم نرم گدے پر ایئر کنڈیشنڈ ڈرائنگ روم میں مجھے بٹھا کر وہ خود باہر چلے گئے۔ میں خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگی۔ تھکان سے بوجھل پلکیں ٹھنڈک پا کر بس مندنا ہی چاہتی تھیں کہ ڈرائنگ روم کی سجاوٹ اور ساز و سامان خاص کر لکڑی کی ایک دیوار پر چھوٹے بڑے فریم میں جڑی تصویروں نے اپنی طرف متوجہ کرلیا اور میں کھڑے ہوکر ان تصاویر کو دیکھنے لگی۔ یقیناً یہ کرنل صاحب کی خاندانی تصویریں ہوں گی۔ اتنے میں کرنل صاحب کمرے میں داخل ہوئے۔ ایک چھوٹی ٹرے میں دو گلاس سرخ مشروب لیے۔ یہ لیجئے تھوڑا جھکتے ہوئے انہوں نے ٹرے میری جانب بڑھائی تو میں نے فوراً ہی گلاس اٹھالیا۔ شکریہ...

مجھے تصویروں کی طرف متوجہ پاکر وہ خود بھی میرے قریب آگئے اور ان تصویروں کے بارے میں بتانے لگے۔ یہ میرے والد ہیں۔ فوج میں کیپٹن تھے۔ یہ میرے تایا ہیں یہ بھی لیفٹیننٹ تھے۔ انہوں نے بڑے ہی فخر سے دونوں کا تعارف دیا اور شاید یادوں میں کھو گئے .....

اس وردی کی تو بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ ماشاء اللہ بہت بارعب خاندان ہے آپ کا۔ کیا کوئی آپ کی اولادوں میں سے بھی؟؟

نہیں، بس میرے بعد..... یہ سلسلہ ختم۔

یہ شاید آپ کی تصویر ہے؟ میں نے ایک تصویر پر انگلی جماتے ہوئے کہا۔

جی ہاں! چالیس برس پرانی۔

عمر کے ساتھ ساتھ ماشاء اللہ آپ میں کافی گریس آگیا ہے۔

میرے اس جملے پر وہ خفیف سا مسکرائے اور خوش ہو کر اپنی بہادری کے کئی قصے بھی سنا ڈالے۔ جنھیں میں بھی بڑی دلچسپی سے سنتی رہی۔

زندگی کے بہت اتار چڑھاؤ دیکھے ہوں گے آپ نے۔

بہت ..... وہ سنانے کے لیے بے چین تھے لیکن مجھے ابھی کئی گھروں میں اور سینسز کرنا تھا۔

یہ شاید آپ کی فیملی کے دوسرے ممبران ہیں۔

ہاں۔ یہ میرا بڑا بیٹا ہے۔ یہ چھوٹا، یہ امریکہ میں سٹل ہے۔ میڈیسن کمپنی میں ملازم ہے۔ بڑا بیٹا ہالینڈ میں ہے۔ بیٹی آسٹریلیا میں ہے۔ یہ ان کے بچوں کی تصویریں ہیں۔ اب تو یہ بھی بڑے ہوگئے ہوں گے۔

ہوگئے ہوں گے۔ مطلب۔ آپ نے انہیں کب سے نہیں دیکھا۔

کئی برس ہوگئے۔ سب کی اپنی اپنی مصروفیات ہیں۔ وقت بدلتا جا رہا ہے۔ اب معمولات پہلے جیسے کہاں ہیں۔ سب اپنی مرضی سے جینا چاہتے ہیں اور یہ ٹھیک بھی ہے۔

اور یہ ..... یہ کس کی تصویر ہے؟

یہ ہم اور ہماری بیگم ہیں۔

بہت خوب ...

کہاں ہیں وہ؟

بیمار ہیں کئی برس سے۔

اوہ .....

اپنا خالی گلاس میز پر رکھتے ہوئے میں صوفے پر بیٹھنے لگی تو انہوں نے کچھ اور چیزیں بھی دکھائیں۔ نایاب کتابیں، تصاویر اور دوسری چیزیں جیسے آرام کرسی، چھت میں لگا فانوس، قالین، ٹیبل لیمپ، رائفلیں انعامات واعزازات، ایک لکڑی کا اور سینگ کا بینت یعنی عصا بھی، ہر چیز چالیس پچاس برس پرانی اور ہر ایک کے ساتھ کوئی نہ کوئی یاد وابستہ۔ اپنے خاندانی انمول ذخیرے کو تاریخی بنا دیا تھا انہوں نے۔ میں سوچنے لگی یہ کمرہ تو ایک بہت بڑا عجائب گھر ہے۔ اور۔ اور کرنل صاحب اس عجائب گھر کی ایک بے چین آتما .....

صوفے پر بیٹھتے ہوئے میں نے میز پر کاغذات پھیلا دیئے اور معلومات درج کرنے لگی۔ اس گھر میں صرف چار افراد تھے۔ ستر سالہ کرنل صاحب اور ان کی بیگم، خان بہادر اور ان کی اہلیہ، خان بہادر کرنل صاحب کے فوج کے زمانے کے خانساماں کے بیٹے تھے جو کئی وجوہات کی بنا پر کرنل صاحب کی تحویل میں آگئے تھے اور تقریباً بیس برس سے گھر کے فرد کی طرح رہتے ہیں۔ ان کے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ کرنل صاحب نے بتایا کہ ان کی بیگم فردوس فاطمہ پر پانچ برس پہلے فالج کا شدید حملہ ہوا تھا تب سے وہ بستر کی ہی ہو کر رہ گئی ہیں۔ خان بہادر کی اہلیہ زرینہ ہی اب ان کی دیکھ بھال کرتی ہیں۔

اوہ ..... میں نے افسوس ظاہر کیا۔

"ہاں۔ یہ میرا بڑا بیٹا ہے۔ یہ چھوٹا، یہ امریکہ میں سٹل ہے۔ میڈیسن کمپنی میں ملازم ہے۔ بڑا بیٹا ہالینڈ میں ہے۔ بیٹی آسٹریلیا میں ہے۔ یہ ان کے بچوں کی تصویریں ہیں۔ اب تو یہ بھی بڑے ہوگئے ہوں گے۔
ہوگئے ہوں گے۔ مطلب۔ آپ نے انہیں کب سے نہیں دیکھا۔ کئی برس ہوگئے۔ سب کی اپنی اپنی مصروفیات ہیں۔ وقت بدلتا جا رہا ہے۔ اب معمولات پہلے جیسے کہاں ہیں۔ سب اپنی مرضی سے جینا چاہتے ہیں اور یہ ٹھیک بھی ہے۔"

کرنل صاحب کی پہلودار شخصیت سے میں بہت متاثر ہوئی۔ میرا دل چاہتا تھا ان سے مزید گفتگو کروں لیکن وقت تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ کاغذات سمیٹتے ہوئے میں نے اجازت چاہی تو وہ بھی میرے ساتھ ساتھ کمرے سے باہر نکل آئے۔

خان بہادر پائپ سے پودوں کو پانی سینچ رہے تھے۔

کرنل صاحب بہت اچھا لگا آپ سے ملاقات کرکے۔ واقعی طبیعت خوش ہوگئی۔ آپ کا گھر بھی بہت اچھا ہے بہت خوبصورتی سے سجایا ہے آپ نے۔ بہت بہت خوبصورت ہے آپ کا گھر۔ آپ تشریف رکھیں میں چلتی ہوں۔ یکایک ان کے جملے نے میرے مڑتے قدم جامد کر دیئے۔

گھر..... ؟؟ گھر کہاں..... ؟ یہ تو بس ایک عمارت ہے۔

کرنل صاحب کے چہرے پر ابھرتی کرب کی لکیروں کی تاب نہ لاتے ہوئے میرے لبوں سے بس اتنا نکلا... خدا حافظ اور پھر میں واپس مڑ گئی۔ اچانک گلاب کی کیاری پر نظر پڑی، پانی کی زیادتی سے بہت سی گلاب کی پنکھڑیاں جھڑ کر گر گئی تھیں اور ان پر گیلی مٹی چڑھ چکی تھی.. ▫

کنول کے پھولوں والا تالاب

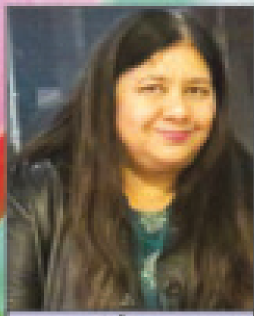

غزال شمیم

ہماری آبائی حویلی کے وسیع آنگن میں مہیب سناٹا پسرا تھا۔

چاند اداس تھا۔ ستارے چپکے ہوئے تھے۔ چاندنی دھندلی سی تھی۔ لکھوری اینٹوں والے لمبے دالان کے اونچے۔ اونچے دروں کے اونچے۔ اونچے ستونوں سے ہلکی۔ ہلکی سسکیاں سی سنائی دے رہی تھیں۔

میں نے گھوم کر پیچھے دیکھا۔ میری بہنیں الگ۔ الگ۔ ستونوں کے پیچھے کھڑی سسک رہی تھیں۔

سب سے پہلے چھٹکی ستون سے باہر نکلی اور آ کر لپٹ گئی۔

''اچھے بھیا.........''

پھر منجھلی.........پھر بڑکی.........ہم سب برسوں بعد مل رہے تھے۔ گنگا جمنا بہہ رہی تھی۔

چچی کے کمزور کندھے کانپ رہے تھے۔ ان شلوکا ممتا سے پھڑک رہا تھا۔

چچی کے چہرے اور غرارے میں ہزاروں سلوٹیں پڑ گئیں تھیں۔

چچا سر جھکائے چارپائی پر باہر بیٹھے تھے۔ حقہ سلگ۔ سلگ کر ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ برسوں بعد مجھے سلام کا جواب سر کے اشارے سے دیا اور کہا تھا۔

''اندر چلے جاؤ اچھے''

تب میں اندر پشتینی حویلی میں داخل ہوا تھا۔

زمین کا مقدمہ لڑتے۔ لڑتے ابا گزر گئے یہ احساس چچا کو دیمک کی طرح چاٹ گیا تھا۔ پھر چچا بھی کہاں زیادہ جیئے۔ بھائی کی بغل والی قبر میں لیٹ گئے۔

ہمارا امام باڑہ قبرستان بن گیا تھا۔

بابا۔ دادا۔ دادی۔ ابا۔ چچا۔ بڑے ابا۔ بڑی اماں سب یہیں دفن تھے۔ مقدمہ چلتا رہا۔ نفرتیں برقرار تھیں......پھر بھی میں اندھیری راتوں میں چھپ چھپ کر چچی سے ملنے جاتا تھا۔ اماں کی دل آزاری بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ حالانکہ اماں جانتی سب تھیں۔ رام پھل ہرواہا کان میں پھسپھسا جاتا۔

''تمہار چچی کہن ہیں کہ اچھے بمبئی سے جب آئیں تو کہنا تالاب کے کنارے سے گزر جیئیں ہمرے دل کا ٹھنڈک پڑ جائے گی۔''

بڑے سے کمل بھرے تالاب کے قریب والی کوٹھری کے روشن دان سے چچی کی بوڑھی آنکھیں مجھے شفقت سے بھگوتی رہتیں۔ میں گھر سے ٹہلنے کے بہانے نکلتا تھا اور تالاب کے کنارے دھیرے دھیرے ٹہلتا تھا۔

میں نے کبھی سر اٹھا کر نہیں دیکھا مجھے معلوم تھا کہ میری پشت پر کئی جوڑی آنکھیں لگی ہیں۔

ہرواہے رام پھل کا چھوٹو بڑا چغل خور ہے اماں سے جڑ دیتا۔

''اچھے بھیا تالاب کیتی ٹہلت رہے۔''

''کا ہے اچھے''

''مقدمہ چلتا رہا۔ نفرتیں برقرار تھیں......پھر بھی میں اندھیری راتوں میں چھپ چھپ کر چچی سے ملنے جاتا تھا۔ اماں کی دل آزاری بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ حالانکہ اماں جانتی سب تھیں۔ رام پھل ہرواہا کان میں پھسپھسا جاتا۔''

''ہوں''

''تم کبھی کبھار بمبئی سے آئے ہو؟ کہ مرحوم باپ کی قبر پر پتھر لگائے آئے ہو......؟''

''ناہی اماں......ایسن کو نو بات نہیں ہے......''

''تو کا ہے پھر......چچا سے محبت امنڈ رہی ہے جو ہمار سہاگ......''

اماں کا حلق آنسوؤں نے بند کر دیا

''تامی اماں......'' میں اماں کو اپنی بانہوں میں سمیٹ کر ان کے تخت پر بیٹھ جاتا۔

مجھے معلوم تھا کہ میری اماں کو میری جان کا بھی خطرہ ہے اور اس سے بھی بڑا خطرہ صندل کی طرف سے ہے۔ لیکن اماں یہ بھی جانتی تھیں کہ ان کا اچھے، ان کا اکلوتا بیٹا ان کا دل نہیں دکھا سکتا۔

لالٹین کی مدھم روشنی میں، میں نے دیکھا چچی کے غرارے کی چھینٹ کا رنگ جگہ جگہ سے اڑ چکا تھا۔

مجھے یاد آیا کہ یہ چھینٹ کا کپڑا میں بمبئی سے لایا تھا۔

میں رات کے اندھیرے میں بنڈل بغل میں داب کر چپ چاپ آتا تھا۔

گاؤں میں نہ تب بجلی تھی نہ اب تھی۔ پچھڑا دیہات تھا بہنوں کے لیے سستے معمولی تحفے بھی لے آتا تو وہ خوش ہو جاتیں۔

خوشبو بتا رہی تھی کہ صندل اب بھی کسی ستون کے پیچھے چھپی کھڑی ہے۔ صندل سے میری ٹھیکرے کی مانگ تھی۔ اماں نے صندل کے پیدا ہوتے ہی چچی کی گود میں چاندی کا چھچھا تا سکہ ڈال کر اسے میرے لیے مانگ لیا تھا۔

لیکن جب چچا نے ابا کی زمین گپ چپ اپنے نام کرالی اور پشتینی حویلی سے ابا اٹھ کر الگ پرانے اصطبل میں رہنے لگے تب اماں نے دل پر پتھر رکھ لیا اور صندل سے رشتہ خاموشی سے توڑ دیا۔

خالہ کی بڑی لڑکی عذرا سے میرا نکاح مجھ کو بتائے بغیر ہی طے کر دیا۔

مجھے بمبئی سے ابا نے زبردستی اپنی بیماری کا تار بھیج کر بلا لیا تھا اور جب میں صندل کے خواب دیکھتا ہوا دھول پھانکتا اصطبل والے نئے گھر میں داخل ہوا جب تک میں کچھ سمجھ پاتا عذرا کا ہاتھ تھما دیا اور فوراً بمبئی واپس روانہ کر دیا۔

صندل نے چاندی پیشانی پر سلام کا ہاتھ پھیرا۔ چاند اوٹ میں چلا گیا۔ ہاتھ میں کانچ کی وہی دھانی رنگت والی چوڑیاں تھیں جو میں نے کبھی بھنڈی بازار کے ٹھیلے سے خریدی تھیں اور چاندنی رات میں بڑے تالاب کے کنارے صندل کو بیٹھا کر بڑے ارمان سے خود پہنائی تھیں۔

اس رات جگنوؤں نے دیوالی منائی تھی۔

آنگن کے داہنی طرف والی کوٹھری میں ایک میلا سا چراغ جل رہا تھا۔ ......کون ہے......ہواں؟''

''منا کی بہو......پہلوٹھی کا لڑکا ہے......'' چچی کی آواز تھکی سی تھی۔ میں ادھر مڑ گیا۔

کوٹھری میں عجیب سی مہک تھی۔ کڑوے تیل۔ دودھ۔ گندے گیلے پوتڑوں کی......موٹی۔ موٹی چوڑیوں والے ہاتھ نے سلام کیا۔

روئی کے گھتے پر لیٹا ننھا سا بچہ ایک دم الٹے توے سا کالا تھا۔ اس کی بڑی۔ بڑی اجلی آنکھیں مجھے دیکھ رہی تھیں۔ ننھی۔ ننھی کلائیوں میں کالے ڈورے میں کالے پوت کے موتی بندھے تھے مجھے وہ ایک دم منا لگا۔

چچی تو دودھ سے بنی تھیں۔ اماں سانولی تھیں۔ میں چچی پر پڑا تھا۔ میرے اتنے سرخ ہونٹ تھے کہ صندل ہنستی تھی۔ ''اچھے بھیا لالی لگات ہیں۔'' اور میں سرخ ہو جاتا تھا۔

میں نے بچے کو گود میں اٹھا لیا۔ چوما اور بند مٹھی کھول کر اپنی جیب سے تڑا مڑا سو کا نوٹ ڈھونڈ کر اس کی ننھی سی مٹھی میں بند کر کے کوٹھری کے باہر نکل آیا۔

باہر ٹھنڈی ہوا تھی۔

چائے کی کشتی جی ہوئی لگ چکی تھی۔

چچی نے اپنی چارپائی پر میرے لیے جگہ بنا دی۔

''او حیدر تمرے بڑے ہوا کا کرت ہیں؟''

''جی سافٹ ویئر انجینئر ہے۔''

''ای کا ہوت ہے......بھئی......'' چچا سر پر کھڑے تھے۔

میں کھڑا ہو گیا۔ ''بیٹھ جاؤ اچھے............''

میں بیٹھ گیا۔

''کو کراسٹن ہے''......بڑی چپ نہیں رہ سکتی تھیں۔

''جی شادی ہو گئی ہے۔''

''کرسٹن صاحب کتاب ہوت ہیں ابا۔'' صندل نے مجھ کو بچایا۔

''اور کیسر (قیصر) کو ہندو سے عشق فرما رہے ہیں۔''......

''سب خبر ہے ہم کا''......منا آ کر چارپائی کے پائتیں کھڑا ہو گیا۔

چچا اٹھ کر باہر چلے گئے۔ میں چپ رہا۔

منا نے کسی ٹولے کی عورت گھر میں بیٹھا لی ہے سب کو پتا تھا اور اس حرکت سے چچا اور منا کی بات چیت بند تھی۔

''تو کا بھوا...... آج کل کے بچے ہیں خوب پڑھے لکھے ہیں۔ بڑی بڑی نوکری ما ہیں...... کوئی اچھے تھوڑی ہیں کہ ہر جگہ سر جھکا دیں......''

چچی نے منا کو گھورا۔

''ساوی تو نکاح کرکے کریں گے نا...... مجیب بدل کر......؟''

منا اپنی حرکتوں سے باز نہیں آ سکتا ہے اس کی صحبت ہی خراب ہے۔ مجھے یکایک لگا کہ منا کے پورے جسم میں جگہ جگہ سیاہ سفید لمبی لمبی داڑھیاں اُگ آئی ہیں اور وہ پھنپھنا رہی ہیں۔

چچا کی داڑھی بھی اتنی سخت اور نوکیلی نہیں تھی جتنی اس کی تھی۔

''جی نہیں''۔ میں اچانک سخت ہو گیا۔

''ارے...... اچھا...... کا ہے بھئی...... یا انگریجی پڑھ کر آپ بھی انگریج ہو گئے ہیں کا؟...... وہرہے......؟'' منا ایکٹنگ میں بھی ماہر ہو گیا ہے۔

''کیوں کہ ہر ایک کو اپنی طرح جینے کا حق ہے۔'' میں نے چائے کی خالی پیالی چارپائی کے نیچے رکھ دی۔

''کتنی بار اس تالاب میں رپٹا تھا کیچڑ سے لت پت ہوا تھا۔ خوب۔ خوب تیرا تھا۔ کتنے کنول کے پھول چرا کر صندل پر چڑھائے تھے۔ آج اتنے بڑے شفاف پانی کے تالاب کو گندگی اور جل کھمبی لیل رہی تھی''

مجھے قیصر کی گرل فرینڈ انیتا جسل یاد آئی جس نے مجھے فون کیا تھا کہ وہ مجھ سے مل کر کچھ بات کرنا چاہتی تھی۔ میں نے اسے دیکھا نہیں تھا صرف گھر میں اس کا ذکر سنا تھا۔ میں لوکل ٹرین کے اسٹیشن بھی گیا شدید بارش تھی بادل پھٹا تھا۔ شاید اس کی ٹرین چھوٹ گئی تھی میں کئی گھنٹے بارش میں کھڑا بھیگتا رہا۔ انتظار کرتا رہا۔ وہ نہیں آ پائی۔ مجھے بڑی شرم محسوس ہو رہی تھی ہر آتی۔ جاتی جوان لڑکی کو دیکھنا پڑ رہا تھا کہ کہیں یہ انیتا تو نہیں۔ وہ اب بھی قیصر کی زندگی میں ہے یا نہیں قیصر کچھ نہیں بتا رہا ہے انیتا کا بھی بعد میں کوئی فون نہیں آیا۔ اور یہاں سب کچھ بِتا ہے۔ رات کے اندھیرے میں ہی دیر تک تالاب کے کنارے چپ چاپ اکیلا ٹہلتا رہا۔ کوئی جگنو بھی نہیں چمکا۔

اس بڑے تالاب میں سے جس بچپن میں سنگھاڑے اتار کر چچی کے پاس لے جاتا تھا وہ چھیل کر مجھے کھلاتی تھیں۔

اس تالاب میں ابا نے روہو مچھلی ڈلوائی تھی۔ میں اچھی بڑی موٹی سی مچھلی پکڑ کر چپکے سے چچی کے یہاں پہنچا دیتا۔ صندل چاول پیس کر مسالے لگا کر ایسا کڑ کڑوا کڑوے تیل میں تل دیتی تھی کہ سب انگلیاں چاٹتے رہ جاتے تھے۔

''کل تالاب میں میں نے ایک بڑی روہو دیکھی تھی...... اچھے......؟''

ابا پوچھتے۔

اچھے چپ۔

کتنی بار اس تالاب میں رپٹا تھا کیچڑ سے لت پت ہوا تھا۔ خوب۔ خوب تیرا تھا۔ کتنے کنول کے پھول چرا کر صندل پر چڑھائے تھے۔ آج اتنے بڑے شفاف پانی کے تالاب کو گندگی اور جل کھمبی لیل رہی تھی۔

''گاؤں کی فضا خراب ہے۔ سنبھل کر جانا۔'' اماں ہمیشہ جب بمبئی سے آکر میں گھر سے باہر نکلنے لگتا کہہ دیتی۔

مجھے معلوم تھا اماں یہ کیوں کہتی ہیں۔ ان کو اچھی طرح پتہ ہے کہ میں آیا ہوں تو پٹے داروں میں جاؤں گا ضرور......

''کچھ کھانا پینا نہیں......'' اماں روکنے کے کئی طریقے اپناتیں۔

''زہر ملا دیں گے تمھارے بھائی بہن......'' ابا کا خون کھول اٹھتا۔ کیونکہ خون تو ان کا اپنا ہی تھا نا...... حالانکہ زمین جائیداد بھی تو ابا کی ہی ماری گئی تھی۔

''جی'' حلق میں صندل کی بنائی کونڈے (22 رجب) کی ٹکیاں اٹک جاتیں کمبخت کتنا موئن ڈالتی ہے اتی...... خستہ۔ اتی خستہ...... جیسے...... جیسے......

چچا کا انتقال ہو گیا۔ خبر اماں نے دی تھی۔ منا جنازے میں شامل نہیں ہوئے۔ ان کی چچا سے بن نہیں رہی تھی ایک دم۔ چچا پکے کانگریسی تھے۔ منا ہر اس پارٹی کے ساتھ ہو جاتے جو اقتدار میں آتی۔ کھیت زمین بھی پارٹیوں کی نذر ہو رہے تھے۔

چچی کے پاس اماں چاہ کر بھی جا نہیں پائی تھیں۔

میں بمبئی سے آیا تو چچی کے پاس گیا تھا۔

''دوئی بار جیل کاٹ آئے منا......'' چچی کی آواز میں لکنت آ گئی تھی۔ لرزا طاری تھا۔

□

''افیم کی کھیتی کرانے لگے ہیں......'' بڑی بولیں۔

''چکھ لیں ہیں......کبھی......کبھی..............''

''ہوں''......میں اٹھ گیا۔

تالاب کے کنارے سے گزرا تو یکا یک مجھے نیلی آپی کی یاد آ گئی۔

یہ راج ہنس تھے۔ جن کو ابا نے بڑے جتن سے پالا تھا۔

تالاب کی رونق تھے چھوٹی بطخیں بھی تھیں جو قطار بنا کر شفاف پانی میں مزے سے تیرتی رہتی تھیں۔ نیلی آپی کی صراحی دار گردن تھی اور چال میں غضب کا بانکپن چلتی تھیں تو لگتا تھا دھرتی ڈول رہی ہے، مور ناچ رہا ہے۔ ان کے شفاف سفید پنکھ اجلے فرشتوں سے چمکتے تھے۔ روز صبح سویرے وہ تالاب کا رخ کر لیتی اور شام ہوتے ہی گھر لوٹ آتیں۔

ایک دن اچانک نیلی غائب ہو گئی......ہر طرف تلاش کیا گیا......نہیں ملی......آپی بیحد غمگین......ایک ماہ بعد آپی بھی گم ہو گئی۔ ابا بیحد رنجیدہ۔ کافی عرصے بعد پچھم والے باغ میں ان کے پر دفن کیے ہوئے ملے۔ پتا چلا کہ یہ بھی منا کا کمال ہے۔ باغ میں دعوت اڑائی گئی تھی۔

برسات میں تالاب چڑھ آتا تھا۔ رات میں ہزاروں جگنو قمقموں کی طرح جگمگاتے تھے۔ قوس وقزح کے رنگ پانی میں جھلملاتے تھے۔ صندل اور میں چاندنی راتوں میں چاند کا عکس تالاب میں دیکھا کرتے تھے۔

میں بمبئی لوٹ آیا۔ چچی کے انتقال کی خبر مجھے ان کے چالیسویں کے بعد ملی۔ میں نے خود کو ہی پُرسہ دے دیا۔ اس رات جو ہو کی بانہوں میں سر رکھ کر خوب رویا۔

رام کھلاون کے چھوٹو نے ہندی میں ایک پوسٹ کارڈ ڈالا مجھے جس سے پتا چلا کہ اماں سخت بیمار ہیں۔ میں عذرا کو لے کر گاؤں پہنچا۔ اماں بمبئی آنے کو تیار نہیں تھیں۔ وہ اپنا گھر اپنی زمین اپنی یادیں چھوڑنا نہیں چاہتی تھیں۔ میری بھی مجبوری تھی بار بار چھٹی لے کر گاؤں جانا آسان نہیں تھا۔ اماں کو اکیلے چھوڑ بھی نہیں سکتا تھا اس حالت میں۔

ٹیوب ویل۔ ٹریکٹر۔ گائے۔ بھینس سب منا کے گُرگے کھول کر لے جا چکے تھے۔ کئی جانور کانجی ہاؤس میں بلاوجہ بند کرا دیے گئے تھے۔ آم کے باغ میں آگ لگوا دی تھی۔ کھڑی فصل جلا دی تھی۔

امام باڑے میں ڈاکہ پڑ چکا تھا۔ سونے چاندی کے علم پنجے غائب۔ حضرت علی اصغر کے گہوارے کا سونے کا جھنجھنا۔ طوق۔ کنگن غائب، ذوالجناح کا چھتر اور تمام سونے کے زیورات غائب۔ جھاڑ فانوس، ہانڈیاں غائب۔ منا بھیا کے کرامات۔

مجھے چوپال کی طرف سے آتا دیکھ کر منا کے گُرگُروں نے نیا ہتھکنڈا اپنایا اور زور۔ زور سے ''منا بھیا کی جے'' چلانے لگے۔

منا اس تخت پر وراج مان تھے۔ جہاں پہلے ابا اور پھر چچا بیٹھتے تھے۔ گاؤں کا پردھان بیٹھتا تھا۔ کئی تصویریں آپس میں گڈمڈ ہونے لگیں۔ ابا کا بلڈ پریشر کا تناؤ نسوں میں بڑھ رہا ہے۔

''ٹیوب ویل۔ ٹریکٹر۔ گائے۔ بھینس سب منا کے گُرگے کھول کر لے جا چکے تھے۔ کئی جانور کانجی ہاؤس میں بلاوجہ بند کرا دیے گئے تھے۔ آم کے باغ میں آگ لگوا دی تھی۔ کھڑی فصل جلا دی تھی۔
امام باڑے میں ڈاکہ پڑ چکا تھا۔ سونے چاندی کے علم پنجے غائب۔ حضرت علی اصغر کے گہوارے کا سونے کا جھنجھنا۔ طوق۔ کنگن غائب، ذوالجناح کا چھتر اور تمام سونے کے زیورات غائب۔ جھاڑ فانوس، ہانڈیاں غائب۔ منا بھیا کے کرامات''

کھلی دھوپ میں منا کا کالا رنگ دمک رہا تھا۔ بال کڑوے تیل میں ڈوبے تھے۔..........دودھ کے جھاگ سا کرتا پانجامہ کناروں سے مٹمیلا پڑ گیا تھا۔ داہنے ہاتھ میں چرس والی بیڑی دبی تھی۔ دیسی کتا پاس میں کھلونے کی طرح پڑا تھا۔ منا اپنی پتلی مونچھوں پہ تاؤ دے رہا تھا۔

جب میں اس کے بہت قریب پہنچ چکا تھا تب ہی دو گرگے سرعت سے لپکے اور لاٹھی تھام کر قلم آگے کر کے میرا راستہ روکنے کی ناکام کوشش کرنے لگے۔ منا مجھے دیکھ کر بھی نہیں اٹھا۔

بایاں انگوٹھا سرخ ہو گیا تھا اتنی شدت سے اس نے ٹانگوں کو دبا لیا تھا۔

مجھے ایک دم وہ ننھا سا منا لگا جو مجھے پہ لیٹا میں دیکھ گیا تھا۔ اس منا کو میں نے گود میں کھلایا تھا۔ لوری سنا۔ سنا کر سلایا تھا۔ کھلونوں سے بہلایا تھا۔ مار۔ مار کر پڑھایا تھا۔ پڑھنے میں منا کچا تھا۔ تالاب میں تیرنا سکھایا تھا۔ کرکٹ کھیلنا سکھایا تھا۔ کھیلنے میں منا تیز تھا۔

''اچھے..........بمبئی سے کپڑا لانا اچھے..............اچھے......''

منا ہمیشہ فرمائش کرتا۔

میرے پہنے ہوئے پینٹ شرٹ جینس اتروا لیتا۔ جوتے موزے، سوئٹر، جیکٹ پر ہاتھ صاف کر لیتا تھا۔ دھوپ کے چشموں، پرس، لائیٹر،

بلٹ کا شوقین تھا۔ روپے پیسے بغیر پوچھے پرس سے نکال لیتا تھا۔

میرا جی چاہا کہ روٹھے ہوئے منا کو زور سے گلے لگا لوں......

لیکن......لیکن......

ایک گرگا اس کا بایاں گھٹنا دونوں ہاتھوں سے دابے تھا کہ کہیں منا بڑے بھائی کو دیکھ کر اٹھ نہ جائیں۔ سلام نہ کرلیں۔ رام پھل ہروابالاٹھی بھانجتا ہوا دوڑتا ہوا میرے پاؤ پہنچا اور ہانپتے۔ ہانپتے کہنے لگا۔

''ہالی (جلدی) چلو مالکن کا دورہ پڑ گوا ہے۔''

میں پلٹ کر چلنے لگا تو اس نے بڑی محبت سے گھر کا۔

''تو کا ہے یہاں آئے؟'' کھیت کی مینڈھ پر چڑھنے سے پہلے ہی میرے پاؤں مدھم ہوگئے۔ پاؤں کے نیچے شائد کرنی (ایک سخت قسم کی گھاس) کا کھونٹا گڑ گیا تھا۔

رام پھل کا چھوٹو مجھے اسٹیشن چھوڑنے اپنی موٹر سائیکل سے جا رہا تھا۔ چچی کا انتقال ہو چکا ہے۔ صندل اپنی سسرال میں ہوگی۔ میں دیکھنا نہیں چاہتا تھا پھر بھی بمبئی جاتے۔ جاتے میری نظر تالاب کے قریب والے روشن دان پر چلی گئی۔
وہاں ایک ننھا منا سا ہاتھ ہل رہا تھا۔ پیچھے موتی۔ موٹی چوڑیوں والے ہاتھ اس کو تھامے تھے۔ تالاب میں پڑی ایک کنول کی کلی کھل رہی تھی۔

''ہم اماں کا بمبئی لے جا رہے ہیں...... مکان و کھیت باغ تمھارے پاس رہیں۔''

''کا ہے؟ بھیا لوگ کا کھبونا ہے ...... محترم ما بھی نا ہی؟''

رام پھل اتنی بڑی ذمہ داری سے گھبرا سا گیا۔

بھیا اس نے حیدر اور قیصر کو کہا تھا۔ حیدر اور قیصر بمبئی مہانگر میں پیدا ہوئے اور اب دونوں دوبئی میں ہیں۔ وہ اس پچھڑے بجلی وہین ٹوٹے کھنڈروں میں کیوں آئیں گے جہاں میرا ماضی، حال اور مستقبل سب دفن ہے۔ وہ اجالوں کے شہر کے واسی ہیں۔ وہاں رفتار ہے زندگی ہے..........

''ہم زندہ رہے تو آئیں گے ان سے تو امید نا ہی ہے......''

رام پھل کی آنکھیں نم تھیں۔ اس کی رگوں میں صدیوں سے مال کی محبت و نمک حلالی خون بن کر دوڑ رہا تھا۔

اماں اور عذرا دو مجھ سے اسٹیشن روانہ ہو چکی تھیں۔

رام پھل کا چھوٹو مجھے اسٹیشن چھوڑنے اپنی موٹر سائیکل سے جا رہا تھا۔ چچی کا انتقال ہو چکا ہے۔ صندل اپنی سسرال میں ہوگی۔ میں دیکھنا نہیں چاہتا تھا پھر بھی بمبئی جاتے۔ جاتے میری نظر تالاب کے قریب والے روشن دان پر چلی گئی۔

وہاں ایک ننھا منا سا ہاتھ ہل رہا تھا۔ پیچھے موتی۔ موٹی چوڑیوں والے ہاتھ اس کو تھامے تھے۔ تالاب میں پڑی ایک کنول کی کلی کھل رہی تھی۔

چھوٹو نے موٹر سائیکل کی رفتار اچانک بڑھا دی۔

ماہنامہ خواتین دنیا

اردو میں سرکاری سطح پر شائع کیا جانے والا واحد رسالہ ہے۔ اس کا یہ پہلا شمارہ ہے۔ مشمولات متن بھی ماہرین ادب و سماج نے طے کیے ہیں لیکن اسے آپ کی پسند و ناپسند کے مطابق تبدیل بھی کیا جا سکتا ہے۔

قارئین سے گذارش ہے کہ نہ صرف اپنے مضامین و تخلیقات ارسال کریں بلکہ اس نہایت ارزاں رسالے کی ممبر سازی کے لیے بھی اپنا تعاون پیش کریں۔

ہندوستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ 10 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http/www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب ہے)

آج ہی اپنے نزدیکی بک اسٹال سے طلب کیجیے یا ہمیں لکھیے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی -110066، فون: 26109746 فیکس: 26108159

E-mail:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

قطار میں کھڑے چہرے

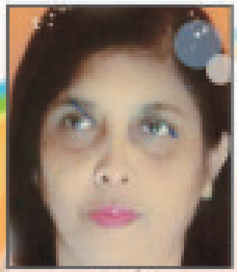

سلمیٰ صنم

کہانی

وہ ایک اداس، دل گرفتہ اور بوجھل سی شام تھی جب فلورا نے دیکھا کوے قطار میں کھڑے ہیں اور آسمان پرندوں سے بھرا ہے۔ دفعتاً کہیں سے Hipco کی ریش میوزک ابھری اور فلورا کو لگا سر میں درد کی ایک شدید سی لہر اٹھی ہے جو سرکتے ہوئے پیچھے کمر کی طرف جارہی ہے۔

''ایبولا'' وہ خوف میں نہا گئی ''کک... کیا... ہم... میں بھی''

وہ اوئلین اگست کے شررباردن تھے اور لائبیریا پر جیسے قہر ٹوٹ پڑا تھا۔ Redemption Hospital میں، پرائیویٹ کلینکس میں کچھ اتنی اموات ہوچکی تھیں کہ حکومت مفلوج ہوکر رہ گئی تھی اور سبھی لائبیریا والوں کی طرح فلورا بھی الجھن کا شکار تھی۔ ہر سنڈے Sermons میں یہ اعلان ہورہا تھا کہ ایبولا فیملی ڈیزیز ہے مگر وہاں کون تھا؟ جو یقین کرتا اپنی بدعنوان حکومت سے وہ لوگ کچھ اتنے نالاں تھے کہ انھیں ایبولا کی موجودگی پر شبہ تھا۔ گو وہ سب دیکھ رہے تھے۔ پڑھ رہے تھے۔ حکومت نے جابجا پوسٹرس لگا رکھے تھے جن پر صاف لکھا ہوا تھا کہ ایبولا حقیقت ہے مگر کوئی یقین کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ ان کا خیال تھا کہ یہ حکومت کی ایک نئی چال ہے۔ دراصل ایبولا کہیں نہیں ہے۔ مگر مرنے والوں کی ایک بھاری تعداد یہ اعلان کررہی تھی کہ ایبولا ہے بالکل ہے۔ اور پھر مترودیا میں خوف و ہراس کی وہ لہر اٹھی کہ لوگوں کو لگا کوئی معمولی بیماری آئی نہیں کہ ایبولا آ گیا۔ اور دہشت کی اس فضاء میں فلپ کی ناگہانی موت اور ڈیوڈ کی پراسرار بیماری۔ کون فلورا پر یقین کرتا؟ آسٹن فیملی یہ کیسے مان لیتی کہ کچھ بہت گمبھیر اور سنجیدہ نہیں ہے۔ کیپٹل ہل والے یہ کیسے باور کرلیتے کہ وہ جو کہہ رہی ہے وہ سچ ہے مگر پھر بھی وہ بضد تھی ہر کسی سے الجھ رہی تھی۔ ''نہیں ایبولا نہیں'' وہ پورے وثوق سے کہہ رہی تھی ''میرے دشمنوں نے فلپ اور ڈیوڈ کو زہر دیا ہے''۔

یوں جیسے تیسے کیپٹل ہل والے مکان میں ڈیوڈ کو جگہ تو مل گئی مگر اپنے جن رشتہ داروں کے ساتھ اس نے کمرہ شیئر کیا تھا جب وہ زندہ نہ رہے تو آسٹن فیملی بپھر گئی۔ ڈیوڈ کا وجود اب ان کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ ادھر پڑوسی الگ مصر تھے کہ ڈیوڈ کیپٹل ہل میں نہیں رہے گا کہیں اور چلا جائے گا۔ تب فلورا ہار گئی۔ انتہائی مجبوری کے عالم میں اس نے ڈیوڈ کو کراؤن ہل بھیج دیا اور خود میا مگر ووالے اس دلدلی علاقے میں آ گئی اور بھلا وہ کیا کرتی؟ وہ مرنا نہیں چاہتی تھی اگر وہ مرجاتی تو پھر آسٹن فیملی کا کیا ہوتا؟ مگر ڈیوڈ... اس نے ایک آہ سرد بھری، دیکھتے دیکھتے یہ کیا ہوگیا تھا یہ ڈیوڈ نے کیا کردیا تھا، کیوں بھلا کیوں فلپ کی بیماری اس نے خود پر اوڑھ لی تھی کتنا منع کیا تھا اس نے کہ وہ فلپ سے نہ ملے مگر پگلا نہ مانا۔ اپنے مرتے ہوئے باپ کی تیمارداری کو گیا تھا خود بیماری اٹھالایا۔ باپ کی محبت کا قرض اتارنے کی دھن میں اب خود ہی جان سے جارہا تھا۔ اور حالات کی اس ستم ظریفی پر فلورا کو لگا درد فقط اس کے سر میں نہیں سارے جسم میں متحرک رہا ہے اپنے اضطراب دروں سے بےکل سی وہ کھڑکی میں آ کھڑی مگر یہ کیا؟ سامنے آنگن میں ریبکا نانی ٹہل رہی تھیں وہ شاید ابھی ابھی نہا کر آئی تھیں ان کے گیلے بالوں سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔

''نانی اور یہاں؟'' وہ دھک سے رہ گئی۔

''یہ کیسے ممکن ہے''۔ وہ اپنا درد بھول گئی۔

مگر وہ تو سامنے ہی تھیں۔ اور ٹہلتے ہوئے فلورا کو دیکھ رہی تھیں۔ دفعتاً فلورا کی آنکھوں کے آگے وہ شام لہرائی جب پہلی مرتبہ اس نے ریبکا نانی کو دیکھا تھا۔ وہ ۱۹۹۰ کی ایسی ہی ایک شام تھی جب صدر سیمویل ڈو کی لاش Executive Mansion کے میدان میں لٹک رہی تھی۔ وہ لائبیریا کے اوئلین خانہ جنگی کے دن تھے۔ کیپٹل ہل والے مکان میں نانی اسی طرح ٹہل رہی تھیں وہ شاید ابھی ابھی نہا کر آئی تھیں ان کے گیلے بالوں سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔

پچاس برس ادھر جب Guinea میں کوکا اگانے کے لئے اسپین کی

کولونیل حکومت کو مزدوروں کی ضرورت پڑی تھی تب لائبیریا نے انھیں مزدور مہیا کیے تھے جو کام ختم ہونے پر بغیر کسی اجرت کے وطن لوٹ آئے تھے اس وقت لیگ آف نیشن نے اس امر کو غلامی سے تعبیر کیا تھا اور ظلم کے خلاف آواز اٹھانے والوں میں ریکا نانی بھی شامل تھیں۔ فلورا کے ماں کی نانی جنھیں سب ریکا نانی کہتے تھے۔ آسٹن ربر فیکٹری کی مالک جو منورویا کی ایک صاحب حیثیت خاتون تھیں۔ پھر کسی دن وہ پراسرار طور پر گم ہوگئیں جانے کہاں؟ انھیں برسوں کسی نے نہ دیکھا اور اب جو اچانک وہ سامنے کھڑی تھیں تو فلورا چکرا گئی تھی۔ ''کیا یہ فریب نظر ہے۔ Hallucinations is it?''۔

وہ زیر لب بڑبڑائی تھی۔ پھر تو ریکا نانی اسے بارہا نظر آئیں کئی بار... کیپٹل ہل والا سارا مکان ان کا تھا۔ یہ بڑا سا آنگن ان کا تھا۔ ہر کمرہ ان کا تھا۔ وہ ہر جگہ تھیں۔ چپ چاپ، گم سم، اداس، متفکر جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی ہوں۔

ایک بے نام سی دہشت، کوئی انجانا سا خوف۔ جس کو پرے دھکیلنے کے فلورا نے عمر بھر جتن کیے تھے۔ وہی خوف وہی دہشت آج بھی اس کے روبرو تھی اور عمر کے اس موڑ پر اس کے اندر اتنی ہمت نہ تھی کہ ان کا مقابلہ کرتی۔ وہ کس قدر الجھتی۔ کس کس سے لڑتی۔ تبھی تو وہ ڈیوڈ کو چھوڑ کر بھاگ آئی تھی۔ پھر ریکا نانی کیوں اس کے تعاقب میں تھیں۔

............2............

میانگرو جھاڑیوں سے سورج ابھرا بلند ہوا اور فلورا کو لگا جیسے وہ دھیرے دھیرے اس کے اندر اتر رہا ہے... اتنی تپش اتنی حدت کہ الامان۔ اس کا تمام تر وجود آگ بنا ہوا تھا۔ وہ پچھلے کئی راتوں سے سوئی نہ تھی۔ اور اسے لگ رہا تھا جیسے کبھی سوئی ہی نہ ہو۔ نیند کسے کہتے ہیں کہ وہ شاید بھول چکی تھی۔ اب تو یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اپنی شناخت اپنی ذات کی آگہی بھی بھول چکی ہو۔ اس کے اندر یہ سوچ مستحکم ہو رہی تھی کہ اب اس کا کوئی وجود نہیں ہے وہ کوئی نہیں ہے؟ وہ فلورا نہیں ہے۔ ''کیا یہ سچ ہے؟'' اس نے اپنے آپ سے پوچھا ''کیا وہ فلورا نہیں ہے''۔ مگر وہ فلورا ہی تھی۔ اس سچ کو وہ کیسے چھپاتی۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور گزرے ہوئے چودہ سال کا کرب اس کی آنکھوں میں ٹھہر گیا۔ اُف! وہ خانہ جنگی... وہ نسلیاتی تصادم.... وہ بے حس حکومتیں۔ وہ بدعنوان سیاستدان وہ حریص لوگ جو لائبیریا کے قدرتی وسائل کی خاطر لڑ رہے تھے، مر رہے تھے۔ وہ افراتفری، وہ خون ریزی، وہ قطار میں کھڑے چہرے، ٹوٹتے ہوئے، بکھرتے ہوئے اُسے لگا جیسے ابھی ابھی سب کچھ ہوا ہے ...ابھی ابھی... دفعتاً موبائل کی گھنٹی بجی تو اسے لگا جیسے اس کے قریب ہی کہیں دھماکہ ہوا ہے، لمحہ بھر کو اس کی چیخیں نکل گئیں۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا ہو رہا ہے رفتہ رفتہ اس نے خود کو سنبھالا۔ کال ریسیو کی تو پتہ چلا کہ خبر تو واقعی ایک دھماکہ ہے۔ آسٹن فیملی کے تین نسلوں سے چار لوگ لقمہ اجل ہو چکے تھے۔ ڈیوڈ مر چکا تھا۔ فلورا تو کھڑی بھی نہ رہ سکی بے ساختہ گر پڑی۔ آسٹن فیملی بکھر رہی تھی۔ ریزہ ریزہ ہو رہی تھی۔ کئی چہرے تھے جو قطار میں کھڑے تھے پتہ نہیں کون کب گم ہو جائے۔ دفعتاً اسے لگا سورج اس کی رگ رگ میں دوڑ رہا ہے۔ وہ آگ کا گولہ بن گئی ہے۔ وہ ہیجانی کیفیت میں مبتلا ہونے لگی۔ اس پر جنون سا طاری ہونے لگا۔ جانے کتنی صدیاں بیت گئیں۔ رفتہ رفتہ اس کو ہوش آیا تو اپنوں کے کھو جانے کا غم کچھ اس قدر شدید تھا کہ اس پر ایک زلزلہ سا طاری ہو گیا۔

''ہائے میرا بچہ—میری فیملی'' وہ ہذیانی انداز میں چیخی۔

''او گاڈ میں کیا کروں'' اس نے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں۔

''اس نے اپنے آپ سے پوچھا ''کیا وہ فلورا نہیں ہے''۔ مگر وہ فلورا ہی تھی۔ اس سچ کو وہ کیسے چھپاتی۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور گزرے ہوئے چودہ سال کا کرب اس کی آنکھوں میں ٹھہر گیا۔ اُف! وہ خانہ جنگی... وہ نسلیاتی تصادم.... وہ بے حس حکومتیں۔ وہ بدعنوان سیاستدان وہ حریص لوگ جو لائبیریا کے قدرتی وسائل کی خاطر لڑ رہے تھے، مر رہے تھے۔ وہ افراتفری، وہ خون ریزی، وہ قطار میں کھڑے چہرے، ٹوٹتے ہوئے، بکھرتے ہوئے اُسے لگا جیسے ابھی ابھی سب کچھ ہوا ہے...ابھی ابھی''

جانے کن کن دشواریوں سے تو اس نے سب کو یوں سنبھال رکھا تھا کہ چودہ سالہ خانہ جنگی بھی ان کا کچھ نہ بگاڑ سکی تھی۔ وہ تو اس خوش فہمی میں مبتلا تھی کہ آسٹن فیملی ہر دن کے ساتھ کچھ اور مضبوط ہو رہی ہے۔ وہ سب ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ہوئے۔ ہر سرد و گرم سہتے ہوئے خوشیوں کی دنیا میں کھو رہے ہیں۔ مگر یہ ایبولا۔ ہائے ظالم نے تو تاک کر خاندانوں پر وار کیا تھا جو جتنا ایک دوسرے کے قریب ہو رہا تھا اتنی ہی سرعت سے موت کے منہ میں جا رہا تھا۔ اُف!! یہ کیسا المیہ تھا۔ لائبیریا

کے خاندان ۔ جو اپنے آپ میں ایک مکمل ادارہ تھے۔ جنھوں نے اس پورے سماج کو باندھ رکھا تھا۔

وہ ٹوٹ رہے تھے۔ بکھر رہے تھے۔ گم ہو رہے تھے۔ یہ حملہ تو خانہ جنگی سے زیادہ خطرناک تھا۔ او گاڈ ۔۔۔ وہ پھر سے ٹوٹنے بکھرنے لگی۔ ریزہ ریزہ ہونے لگی۔ نامعلوم سمتوں میں اڑنے لگی۔ پھر جانے کیا ہوا۔ آنکھوں سے کرب کا دریا امنڈ پڑا۔ اور زار زار روتے ہوئے اس نے دیکھا ربیکا نانی پاس کھڑی ہیں۔ ہولے ہولے گنگنا رہی ہیں۔

ہتووا ۔۔۔ ہتووا

ہتووا ۔ یاؤ

اے لا ۔ نو

نے ہی نیو ۔ لا ۔ نو

نے ہی نیا ۔ لانو

یہ کیا؟ فلورا ششدر رہ گئی نانی اور گیت ۔ وہ تو اپنا رونا بھی بھول گئی۔

......3......

فلک پر پورا چاند اپنی تمام تر حشر سامانیوں سمیت مسکرا رہا تھا مگر وہ تو اندھیروں میں محصور تھی۔ اور ان گھور تاریکیوں میں اس کی آنکھیں کسی بلی کی آنکھوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ کھڑکی کے قریب کرسی پر بیٹھی وہ دور خلاؤں میں یوں تک رہی تھی جیسے اس کا دماغی توازن بگڑ گیا ہو۔ وہ پچھلے کئی راتوں سے سوئی نہ تھی۔ اور اسے لگ رہا تھا جیسے وہ کبھی سوئی ہی نہ ہو۔ نیند کے کہتے ہیں وہ شاید بھول چکی تھی مگر کیا ہی اچھا ہوتا جو وہ اپنا ماضی بھی بھول جاتی مگر وہ تو اسے یوں یاد تھا جیسے ابھی ابھی سب کچھ ہوا ہو۔ وہ لائبیریا کی دوسری خانہ جنگی وہ LURD اور صدر چارلس کی افواج کا تصادم۔ وہ قطار میں کھڑے چھ لاکھ لوگ جو شہید ہو چکے تھے۔ دو ملین لوگ جو زخمی تھے وہ جو شوا ملٹن بالا ہائی جیسے حکومت مخالف وار لارڈ جو معصوم بچوں کو ذبح کر رہے تھے ان کے خون میں نہا رہے تھے اور اعلانیہ کہہ رہے تھے کہ اس طرح وہ گولیوں سے محفوظ رہیں گے۔ وہ توہم پرستی کا عالم کہ سپاہی اپنے حریف کے ٹکڑے کر رہے تھے۔ ان کے دل چبا رہے تھے کہ انھیں بے پناہ قوت حاصل ہو۔ وہ بربریت کی انتہا کہ LURD کے اور چارلس ٹیلر دونوں بچہ سپاہی کا استعمال کر رہے تھے۔ آہ وہ بچے جو لائبیریا کا مستقبل تھے وہ لوٹ مار کر رہے تھے۔ قتل و غارت گری کر رہے تھے۔ اور خوف و دہشت کی اس فضا میں کئی دن ایسے بھی آئے جب اسے لگا کہ وہ ٹوٹ رہی ہے۔

بکھر رہی ہے۔ ریزہ ریزہ ہو رہی ہے۔ نامعلوم سمتوں میں اڑ رہی ہے۔ ایسے میں بار بار۔ لگا تار۔ اس کا دل چاہا کہ وہ گم نام جزیروں کی اور نکل جائے۔ ربیکا نانی کی طرح گم ہو جائے مگر بار بار فلپ اس کی راہ میں آ جاتا تھا۔ فلپ آہ! اس کے کلیجے سے ایک ہوک سی اٹھی۔ فلپ سے محبت کی تھی اس نے مگر کبھی اس کے ساتھ خوشگوار ازدواجی زندگی بسر نہ کر سکی۔ وہ دونوں کچھ اتنے قریب آئے کہ ہمیشہ کے لئے دور ہو گئے۔ فلپ جانے کہاں چلا گیا وہ ڈیوڈ کے ساتھ تنہا رہ گئی۔ اُف! زندگی میں ایسی کئی باتیں ہوتی ہیں جن کی وضاحت ممکن نہیں۔ وہ بے کل سی اٹھ کھڑی۔ آسمان میں پورا چاند بہت حسین لگ رہا تھا جس نے چاروں طرف چاندنی بکھیر رکھی تھی۔ مگر یہ کیا؟ چاندنی بھرے آنگن میں ربیکا نانی ٹہل رہی تھیں اور آج زندگی میں پہلی بار فلورا کا دل چاہا کہ ان سے پوچھیں ایسا کیا ہوا تھا جو وہ گم ہو گئی تھیں۔ ان کا وجود ہمیشہ گیلا سا کیوں ہے؟ وہ تاریکیوں سے الجھتی۔ اپنے آپ کو گھسیٹتی صحن کی جانب دوڑ ہی رہی تھی کہ موبائل کی گھنٹی پاپہ زنجیر بن گئی۔ ادھر جوزف انکل تھے جو کہہ رہے تھے۔ ''ہیلو فلورا۔ کہاں ہو بیٹا۔ کراؤن ہل میں ڈیوڈ کی لاش سڑ رہی ہے اور اس کی بو پڑوسیوں کے گھر رینگنے لگی ہے۔ افسوس کہ ہماری حکومت اس قابل نہیں کہ اتنی سڑی گلی لاشوں کو ٹھکانے لگائے۔ اب تمہارا انتظار ہے کہ تم آؤ تو ڈیوڈ کے آخری رسومات ادا ہوں۔''

''وہ پچھلے کئی راتوں سے سوئی نہ تھی۔ اور اسے لگ رہا تھا جیسے وہ کبھی سوئی ہی نہ ہو۔ نیند کے کہتے ہیں وہ شاید بھول چکی تھی مگر کیا ہی اچھا ہوتا جو وہ اپنا ماضی بھی بھول جاتی مگر وہ تو اسے یوں یاد تھا جیسے ابھی ابھی سب کچھ ہوا ہو''

بے ساختہ موبائل اس کے ہاتھ سے چھوٹ گرا۔ وہ تھر تھر کانپنے لگی۔ مگر یہ کیا؟ سامنے ہی تو ربیکا نانی کھڑی تھیں۔ چپ چاپ، گم سم، اداس، متفکر جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی ہو۔ کچھ کرنا چاہتی ہو۔ زندوں میں لوٹنا چاہتی ہو۔ ان کے چہرے پر اداسی کے تاثرات اتنے گہرے تھے کہ فلورا کو لگا جیسے اس کے اندر ہی اندر کچھ ہوا ہے۔ وہ ٹوٹ رہی ہے۔ دو حصوں میں بٹ رہی ہے۔ پتہ نہیں وہ کونسا حصہ تھا جو اس کے وجود پر حاوی ہو رہا تھا اور پھر وہ کیا کر رہی ہے؟ کہاں جا رہی ہے؟ اس کا علم خود اسے نہ تھا۔

☆☆☆

عزیز بانو داراب وفا

غزلیں

اپنی بجتی ہوئی رنگین جوانی دے گا
مجھ کو تصویر بھی دے گا تو پرانی دے گا

چھوڑ جائے گا مرے جسم میں بکھرا کے مجھے
وقت رخصت بھی وہ اک شام سہانی دے گا

عمر بھر میں کوئی جادو کی چھڑی ڈھونڈوں گی
میری ہر رات کو پریوں کی کہانی دے گا

ہم سفر میل کا پتھر نظر آئے گا کوئی
فاصلہ پھر مجھے اس شخص کا ثانی دے گا

میرے ماتھے کی لکیروں میں اضافہ کر کے
وہ بھی ماضی کی طرح اپنی نشانی دے گا

میں نے یہ سوچ کے بوئے نہیں خوابوں کے درخت
کون جنگل میں لگے پیڑ کو پانی دے گا

ایک دیے نے صدیوں کیا کیا دیکھا ہے بتلائے کون
چھوڑو اگلے وقتوں کے قصے پھر سے انھیں دہرائے کون

اب بھی کھڑی ہے سوچ میں ڈوبی اجیالوں کا دان لئے
آج بھی ریکھا پار ہے راون سیتا کو سمجھائے کون

اپنا اپنا آسن چھوڑ کے ہر مورت اٹھ آئی ہے
اپنے گھر کی اس دیوار سے اپنا بھید چھپائے کون

جانے کتنے راز کھلیں جس دن چہروں کی راکھ دھلے
لیکن سادھو سنتوں کو دکھ دے کر پاپ کمائے کون

ایک نیا سپنا بنتا ہے اور بن کر اس سوچ میں ہے
صدیوں سے آپس میں الجھے دھاگوں کو سلجھائے کون

اب بھی بزرگوں کی باتیں سن کر اچھا تو لگتا ہے
پر ان گرتی دیواروں سے اپنی پیٹھ لگائے کون

ڈاکٹر شائستہ یوسف

تلاش

میں نے راستے میں پڑے ہوئے
پودے کو اٹھا کر
آنگن میں بو دیا
پھلتے پھولتے درخت کے پتے اور پھول
لاوارث درخت کی
تقدیر کو سنوارتے دیکھ کر
میری صبح مسکرانے لگی
آہستہ آہستہ پیڑ کی جڑیں
پھیل گئیں
پیڑ نے سر جھکا لیا
میں باؤلی سی ہو گئی
جھکے ہوئے سر نے
مٹی کو کھانا شروع کر دیا
ساری جڑیں
سر سے نکل کر
ہر طرف پھیل گئیں
میرے دروازے، دریچے اور چھت
جڑوں سے بھر گئے
اور میں
نئے مکان کی تلاش میں
پھر سے بھٹکنے لگی

فن کی موت

ہر لفظ معانی کھو بیٹھا
اور کاغذ پر چلنے والی
کالی کالی بدروحیں
بال بکھیرے ہاتھوں میں تلوار لیے
فن کی لاش اٹھائے چل دیں
بھولی بسری
تاریخ میں پیوستہ حقیقت
کہانی بن کر
آنے والی نسلوں کو
کیا روداد سنائے گی!
اور پھر کیا حقیقت بھی
قصہ بن کر خود سے آنکھ چرائے گی
کس کو فرصت ہے کہ
اس اندھیارے جنگل میں
گیلی لکڑی کو چن چن کر
دھوپ دکھائے
آگ لگائے
بکھرے بکھرے اوراق سمیٹے
دیمک سے الفاظ چنے
اور پھر
ان کو معنی دے۔
☆☆☆

شبنم عشائی

عشق خوشبو نظمیں

یہ برتی بارش ہے کہ
تمہاری میٹھی رفاقت کی بوندیں
جو مجھ پہ برس رہی ہیں
چاہت کا انوکھا سیک
میرے بھیگے تن کو سکھا رہا ہے
پر بیگا من
تمہاری چھون لئے
وہی کہیں
تمہارے پاس پڑا ہے
دیکھو ذرا
تمہاری مسافتوں کو
اس کا احساس
نہیں شاید

☆☆☆

محبت نا سمجھ ہے
بار بار
سر اٹھاتی ہے !
شعلوں کی لپک سے حسرت بھر کر
اپنے ہالے سے
شہر خواب ڈھونڈنے
ٹلی ٹلی نکلتی ہے
کبھی چراغ
تو کبھی
چاندنی میں ڈھلتی ہے
کبھی اپنے ہی ہاتھوں سے
پھسلتی ہے
بکھرتی ہے !

تو دور ہے
کوسوں دور ہے لیکن
محبتوں میں رچے رستے
مختصر ہیں بہت
کروٹ کی بانہوں جتنے مختصر ......
مصنوعی شہر سے
تمہاری سرد آہیں
میری شہ رگ پہ
اپنے ہونٹ رکھتی ہیں
کبھی سبزے پہ چلتی ہیں
تو کبھو
بلیوارڈ پہ ٹہلتی ہیں
کبھی پل کے گرد
پورا چکر کاٹتی ہیں
تو کبھو
مخدوم صاحب کے
زینے چڑھتی ہیں
چرار شریف میں منت مانگتے ہوئے
دھاگا باندھتی ہے
اور ویری ناگ کے چشمے میں
اپنا
چہرہ تکتی ہیں

☆☆☆

سوال؟؟

خیالات کے بے کراں
اور گھنے جنگلوں میں
یہ انساں ہیں یا ہیولے ہیں ان کے
سوالات کی جن پہ یلغار ہے
یہ کوشاں رہے ہیں جوابات کی چاہ میں
زمیں آسماں شہر کی بستیاں
درد کی تتلیاں گھر سے اٹھتا دھواں
بچپنے کی مہکتے خوشی کے سوال
نوجوانی کے آگے بھٹکتے سوال
اب بڑھاپے کی دہلیز پر آ کے ٹھہرے ہوئے ہیں
سسکتے سوال
اور جوابوں کی خواہش
بھیانک بھنور بن چکی ہے
اب انساں ان کا تعاقب کرے بھی تو کیونکر
سوالات کا ایک چٹیل علاقہ
جہاں زندگی ایک تنہا مسافر
سرابوں سے بھٹکی سمندر سے گزری
کبھی خوں سے رنگین راہوں سے گزری
طلب کا سمندر بھی اب
ریگ زاروں میں تبدیل ہونے لگا ہے
مجھے خوف ہے کہ جوابات کی چاہ میں
کوئی پاگل سوالات کا یہ سمندر
جلا دے تو کیا ہو؟

”میرے بعد“

میری آواز کی خوشبو سے مہکتا آنگن
میرے خوابوں سے سجے ہوں گے در و بام ترے
رقص احساس میں کرتی
میرے پائل کی کھنک
میرے کھوئے ہوئے خوابوں کا پتہ پوچھے گی
کبھی بارش کی چھلکتی بوندیں
اور کہیں قطرۂ شبنم گل پر
جھلملاتے ہوئے جگنو بن میں
جیسے احساس کی سرحد پہ
تری یاد کا دیپ
یہ سب انمول خزانے ترے اپنے ہوں گے
تیرے فردا کی حفاظت بھی انہیں سے ہوگی
اور مرے بعد یہی یاد دلائیں گے مری

حسنِ سخن

ڈاکٹر نصرت مہدی

غزلیں

عشق میں مجنوں و فرہاد نہیں ہونے کے
یہ نئے لوگ ہیں برباد نہیں ہونے کے

یہ جو دعوے ہیں محبت کے ابھی ہیں جاناں
اور دو چار برس بعد نہیں ہونے کے

کیا کہا توڑ کے لاؤ گے فلک سے تارے
دیکھو ان باتوں سے ہم شاد نہیں ہونے کے

نقش ہیں دل پہ میرے اب بھی تمہارے وعدے
خیر چھوڑو وہ تمہیں یاد نہیں ہونے کے

گھر لئے پھرتی ہوں ہر وقت تمہارے پیچھے
تم مگر وہ ہو کہ آباد نہیں ہونے کے

منع ہے رسم و رواجوں سے بغاوت کرنا
یہ سبق مجھ کو مگر یاد نہیں ہونے کے

ہم نے خود پہنی ہے نصرت یہ وفا کی زنجیر
ہم تو خود ہی کبھی آزاد نہیں ہونے کے

☆☆☆

عشق رقصاں ہوا ہم دونوں میں خوشبو کی طرح
میں کہ اب میں نہ رہی تو بھی نہیں تو کی طرح

چھا گیا روح پہ احساس طلسمی تیرا
میں بھی طاری ترے اعصاب پہ جادو کی طرح

میری تنہائی میں ہے نغمہ سرا تیری یاد
تیری دھڑکن میں مری گونج ہے گھنگرو کی طرح

خاک اڑاتا ہے اگر دشت جنوں تیز میں تو
میں بھٹکتی ہوں تری ذات میں آہو کی طرح

رنگ سب ترے منسوب ہیں مجھ سے اور میں
تجھ میں روشن ہوں شب ہجر میں جگنو کی طرح

یہ ترے دید کی خواہش ہے دھنک کی صورت
کھنچ گئی ہے جو فلک پر مرے ابرو کی طرح

مرحلہ ضبط کا ہے عشق میں سنبھلو نصرت
چشم احساس میں ٹھہرے ہوئے آنسو کی طرح

☆☆☆

حسنِ سخن

ڈاکٹر قمر سرور

غزلیں

کس نے کہا کہ گردِ سفر لے گئی ہوا
آنکھوں میں تھی جو تابِ نظر لے گئی ہوا

کر دے تو اس کے گھر کو منور میرے خدا
میرا چراغ چھین کے گھر لے گئی ہوا

میں نے کتاب کھول دی اک روز عشق کی
سارے ورق اُڑا کے، مگر لے گئی ہوا

شاخوں کا جھولا، اس نے جھلایا تھا ہوش میں
پاگل ہوئی تو برگِ شجر لے گئی ہوا

دل بجھ گیا تو آنکھ کا منظر بدل گیا
آشوبِ چشم دے کے نظر لے گئی ہوا

منزل ملی تو پاس میں کچھ بھی نہیں رہا
جو کچھ بچا تھا رختِ سفر لے گئی ہوا

کالی گھٹا سروؔر تہی دست ہو گئی
بارش برسنے والا ہنر لے گئی ہوا

عکس سب ہیں یہاں آئینہ کون ہے
میں ہوں عاصی اگر پارسا کون ہے

دل کی دھڑکن میں آخر چھپا کون ہے
میں نہیں ہوں تو پھر دوسرا کون ہے

دوپہر تک ہے بس گرم سورج کا ڈر
شام ہو جائے تو پوچھتا کون ہے

وہ بھی خاموش ہے، میں بھی خاموش ہوں
دیکھنا ہے یہی بولتا کون ہے

جب نہیں ہے کوئی پھر یہ آہٹ سی کیوں
اُن دریچوں سے اب جھانکتا کون ہے

اس قدر پیار کا درد بڑھ جائے گا
دل لگا کر یہاں سوچتا کون ہے

میں ہوں خود آئینہ میں ہی تصویر ہوں
مجھ کو میری طرح دیکھتا کون ہے

لذیذ پکوان، فرحت بخش مشروبات

چکن ویجی ٹیبل پکوڑے

مرغ کا قیمہ ایک کپ، کٹی ہوئی بند گوبھی آدھا کپ، ابلے ہوئے مٹر آدھا کپ، ابلے ہوئے آلو دو عدد، کارن فلور چار کھانے کے چمچ، میدہ دو کھانے کے چمچ، نمک حسب ذائقہ، سویا ساس ایک کھانے کا چمچ، اجی نو موتو آدھا چائے کا چمچ، انڈا ایک عدد، آئل حسب ضرورت۔

ترکیب: مرغ کے قیمے میں بند گوبھی، مٹر اور ابلے ہوئے آلو ڈال کر اچھی طرح مسل کر ملا لیں۔ پسی ہوئی کالی مرچ، سویا ساس نمک، اجی نو موتو اور لیموں کا رس ڈال کر تھوڑی دیر کے لیے رکھ دیں پھر اس آمیزے میں میدہ اور کارن فلور بھی ملا لیں، اب انڈے کو پھینٹ لیں۔ کڑاہی میں آئل گرم کریں اور تیار آمیزے کے چھوٹے چھوٹے پکوڑے بنائیں انڈے میں ڈبو کر کڑاہی میں ڈالتی جائیں دھیمی آنچ پر سنہرا ہونے تک تل لیں ٹماٹو کیچپ کے ساتھ پیش کریں۔

پکوڑے

اجزاء: بڑی ہری مرچیں چھ سے آٹھ عدد، بیسن چار کھانے کے چمچ، پسا ہوا اچور (کھٹائی پاؤڈر) آدھا چائے کا چمچ، سفید زیرہ ایک کھانے کا چمچ، لال مرچ پسی ہوئی آدھا چائے کا چمچ، نمک حسب ذائقہ، لہسن پسا ہوا، ایک چوتھائی چمچ، ہلدی پسی ہوئی ایک چائے کا چمچ، مصالحہ، اجوائن آدھا چائے کا چمچ، کوکنگ آئل تلنے کے لیے۔

ترکیب: بیسن میں نمک لال مرچ، کھٹائی پاؤڈر۔ زیرہ، لہسن، ہلدی، گرم مصالحہ، دھنیا اجوائن اور دو سے تین چمچ پانی ڈال کر گاڑھا سا پیسٹ بنا لیں۔ مرچوں کو صاف دھو کر چیرا لگا لیں اور چھوٹے چائے کے چمچ کی مدد سے یہ پیسٹ تھوڑا تھوڑا بھر دیں۔ پھر ان کو اچھی طرح بند کر دیں اور دس منٹ کے لیے فریج میں رکھ دیں۔ اس کے بعد دو پیالی بیسن کو چھان کر اس میں حسب ذائقہ نمک، آدھا چائے کا چمچ ہلدی، آدھا چائے چمچ لال مرچ اور چٹکی بھر میٹھا سوڈا ملا لیں۔ تھوڑا تھوڑا پانی ڈال کر گاڑھا سا پیسٹ بنا لیں اور کڑاہی میں کوکنگ آئل کو درمیانی آنچ پر تین سے چار منٹ گرم کریں۔ مرچوں کو فریج سے نکال کر بیسن کے آمیزے میں ڈبو ڈبو کر کڑاہی میں رکھے ہوئے کوکنگ آئل میں ڈالنا شروع کریں اور سنہرا فرائی ہونے پر نکال لیں۔ گرم گرم نان اور روٹی کے ساتھ پیش کریں۔

آڑو کا ملک شیک

اجزا: آڑو 10 عدد (چھیل کر ٹکڑے کر لیں)، بادام کی گری آدھا کپ، دودھ دو گلاس سبز الائچی چار عدد، شہد تین کھانے کے چمچ، کشمش 5 کھانے کے چمچ، چینی 5 کھانے کے چمچ، برف حسب ضرورت۔

ترکیب: دودھ میں سبز الائچی ڈال کر ابال لیں اور اسے فریج میں رکھ کر اچھی طرح ٹھنڈا کر لیں، بادام کی گریاں دو تین گھنٹے پانی میں بھگو کر رکھیں اور پھر ان کا چھلکا اتار لیں، بادام اور کشمش کو گرائنڈر میں ڈالیں اور اس میں دو تین چمچ دودھ ڈال کر اچھی طرح گرائنڈ کر لیں، جب آمیزہ یکجان ہو جائے تو اسے بلینڈنگ جگ میں ڈال دیں، اس میں آڑو کے ٹکڑے کر کے ڈالیں، اس میں شہد، چینی، برف اور دودھ ڈال کر اچھی طرح بلینڈ کریں، ٹھنڈا ٹھنڈا مہمانوں کو سرو کریں۔

لیموں کا شربت

اجزا: لیموں کا رس ڈیڑھ پاؤ، چینی تین پاؤ، پانی آدھا کلو، پیلا رنگ ایک چٹکی (کھانے والا)

ترکیب: سب سے پہلے لیموں نچوڑ کر اچھی طرح سے رس نکال لیا جائے اور پھر کپڑے میں چھان کر اس کو الگ رکھ لیں۔ اس کے بعد ایک دیگچی میں چینی اور پانی ڈال کر چولہے پر چڑھا دیں اور ہلکی آنچ پر پکنے کے لیے رکھ دیں۔ جب تین چار جوش آ جائے تو لیموں کا رس ڈال دیا جائے اور پکنے دیں۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد چمچہ ہلاتے رہیں ورنہ نیچے لگ جانے کا اندیشہ ہوگا۔ چمچے کی مدد سے دیکھتے رہیں۔ جب چاشنی ایک تار کی ہو جائے تو نیچے اتار لیں اور ٹھنڈا ہونے کے لیے رکھ دیں اور جب ٹھنڈا ہو جائے تو صاف اور خشک بوتلوں میں بھر لیں۔ گرمیوں کے موسم میں یہ شربت دماغ کی خشکی دور کرنے کا موجب ہوتا ہے اور اس کو پینے سے ہمیشہ دل و دماغ کو تازگی و فرحت عطا ہوتی ہے۔

فروٹ سلاد

اجزا: سیب: ایک عدد، امرود ایک عدد، تربوز ایک کپ، چیکو ایک عدد، چیری/ پائن ایپل ایک کپ، کریم ایک کپ، چینی چار کھانے کے چمچ، بادام (فرائی کر کے پیس لیں) دو چمچ، انگور سجاوٹ کے لیے۔

ترکیب: ایک پتیلی میں آدھا کپ پانی گرم کریں اور اس میں چینی شامل کر کے شوگر سیرپ بنا لیں۔ اس بات کا دھیان لازمی رکھیں کہ چینی کے ذرات مکمل طور پر گھل جائیں۔ تمام پھلوں کے چھلکے اتار کر انھیں باریک کاٹ لیں۔ پھر ان تمام پھلوں کو باؤل میں ڈال کر اس میں شوگر سیرپ، کریم اور پسے ہوئے بادام شامل کر دیں۔ تمام اجزا کو اتنا مکس کریں کہ یکجان ہو جائیں۔ آخر میں فروٹ سلاد کو انگور سے سجا دیں۔

گاجر کا ملک شیک

اجزا: گاجر آدھا کلو، دودھ ایک کلو، الائچی حسب ذائقہ، کوکنگ آئل ایک کھانے کا چمچ، چینی حسب ذائقہ

ترکیب: سب سے پہلے گاجریں چھیل کر دھو کر کدوکش کر لیں اب ان کو کسی کھلے منہ والے برتن میں ڈال دیں اور کوکنگ آئل کا ایک چمچ اور الائچی کے دانے ڈال کر اچھی طرح بھونیں جب یہ اچھی طرح بھن جائیں تو اس میں آدھا گلاس پانی ڈال کر ڈھانپ دیں اور ہلکی آنچ پر گلنے دیں۔ جب گاجریں اچھی طرح گل جائیں تو باہر نکال کر ٹھنڈی کر دیں پھر ان گاجروں کو جوسر میں ڈالیں۔ پھر دودھ ڈالیں اپنی پسند کے مطابق چینی ڈالیں اور اچھی طرح بلینڈ کر لیں۔ گاجر کا ملک شیک تیار ہے۔ اسے گاڑھا بنے دیں۔ پانی ملا کر اس مشروب کو آپ گرمیوں میں ٹھنڈا کر کے اور سردیوں میں گرم کر کے دونوں طرح استعمال کر سکتی ہیں دونوں طرح مزیدار ہے اور افادیت کا حامل ہے۔

زیبائش

چہرے اور جلد کی خوبصورتی کے لیے کارآمد نسخے

○ ایک عدد سرخ پکا ہوا ٹماٹر لے کر اس کے دو ٹکڑے کرلیں اور چہرے پر اچھی طرح رگڑیں۔ پندرہ منٹ بعد چہرہ دھولیں۔ چہرے کی رنگت نکھر آئے گی۔

○ دودھ میں بادام رگڑ کر لئی سی بنالیں۔ اس لئی کو چہرے پر ملنے سے آپ کی رنگت نکھر آئے گی۔

○ جو کا آٹا، سونف، خربوزے کے بیج اور سنگترے کے چھلکے ہم وزن لے کر اچھی طرح پیس لیں، اس سفوف کو صبح شام چہرے پر ملنے سے چند ہی روز میں چہرہ نکھرا نکھرا نظر آئے گا۔

○ گیہوں کا آٹا اور بیسن آدھ آدھ پاؤ، سنگترے کے چھلکے 50 گرام اور 10 گرام صندل ان تمام اجزاء کو باریک پیس لیں اور روزانہ رات کو سونے سے قبل دودھ میں شامل کرکے چہرے پر لگائیں۔ چند ہی روز میں چہرہ سرخ و شاداب ہوجائے گا۔

○ اگر چہرے پر قبل از وقت جھریاں نمودار ہونے لگیں تو ایک عدد دیسی انڈے کی زردی الگ نکال دیں اور صرف سفیدی لیں۔ اسے پھینٹیں اور اس میں ایک چمچ خالص شہد کا ملا لیجئے۔ پندرہ منٹ تک لگا رہنے کے بعد چہرہ نیم گرم پانی سے دھویئے اور اس کے بعد ٹھنڈے پانی کے چھینٹے ماریئے۔ اب چہرہ تولیے کی مدد سے خشک کر لیجئے۔ یہ عمل چہرے کی پژمردگی اور اضمحلال ختم کر دیتا ہے اور جھریوں سے نجات مل جاتی ہے۔

○ مندرجہ بالا عمل چونکہ قدرے طویل ہے اس لیے مصروف زندگی گزارنے والی خواتین کے لیے قابل عمل نہیں۔ ایسی خواتین کو چاہیے کہ انڈے کی سفیدی کو روئی کی مدد سے چہرے پر لگائیں اور پندرہ منٹ بعد دھولیں۔ جھریاں ختم ہوجائیں گی۔

○ دن میں تین بار چہرے پر لیموں کے رس کی مالش کرکے نصف گھنٹے بعد دھو لینے سے چہرے پر پڑنے والی جھریوں اور شکنوں کی افزائش رک جاتی ہے۔

○ گیہوں کا آٹا اور بیسن 50-50 گرام تھوڑی سی ہلدی، سنگترے کے چند خشک چھلکے اور تھوڑا سا سفید صندل تمام اجزا کو باریک پیس کر آمیزہ بنالیں اور تھوڑا تھوڑا سا پانی ڈال کر ہر روز چہرے پر ملیں۔ چکنائی کے لیے دودھ کی بالائی استعمال کی جاسکتی ہے۔ چند روز لگاتار اس عمل کو کرنے سے چہرے کی خوبصورتی میں نکھار اور نمایاں اضافہ ہوگا۔

○ گیہوں کا آٹا اور ہلدی ہم وزن لے کر گائے کے دودھ میں ملا کر یکجان کرلیں۔ اس آمیزے کو ابٹن کی طرح چہرے پر ملنے سے چند ہی دنوں میں چہرہ نکھر جاتا ہے۔

○ اگر چہرے پر سیاہیاں نمودار ہونے لگیں تو ٹماٹر کا رس ملنے سے چہرہ شاداب ہوجاتا ہے اس کے علاوہ چہرے کے سیاہ پڑنے کی صورت میں چند روز تک اسے دودھ سے دھونا بھی مفید ہوتا ہے۔

○ ایک انڈا خوب اچھی طرح پھینٹ کر 10 گرام شہد اور 10 گرام دودھ میں ملا کر صبح و شام چہرے پر لگائیں۔ چہرے کی رنگت نکھر آئے گی۔

○ خشک موسم میں کچے دودھ کی بالائی سے چہرے کی مالش کریں اور نصف گھنٹے بعد دھولیں۔ آپ کا چہرہ نہ صرف خشک موسم کے مضر اثرات سے محفوظ رہے گا بلکہ اس کی رنگت میں نمایاں نکھار بھی رونما ہوگا۔

○ چہرے کے مسامات بند ہونے کی صورت میں بارش کے پانی سے چہرے دھوئیں۔ بند مسام کھل جائیں گے۔

○ مولی کے بیج باریک پیس کر ان میں دودھ کی بالائی میں شامل کرلیں۔ رات سونے سے قبل چہرے پر لگائیں اور صبح کسی اچھے صابن سے دھولیں چہرے کی ماند پڑتی ہوئی رنگت نکھر جائے گی۔

○ خمیری آٹے سے صبح سویرے چہرہ صاف کرنے سے رنگت صاف ہو جاتی ہے۔

○ کسی تقریب میں شمولیت سے کچھ دیر قبل اگر چہرے پر کوئی پھنسی وغیرہ نمودار ہو جائے تو برف کا ٹکڑا صاف ستھرے کپڑے میں لپیٹ کر تھوڑی دیر کے لیے اس پر رکھیں۔ اس طرح پھنسی دب جائے گی اور کم از کم چوبیس گھنٹے تک دوبارہ نہیں پھوٹے گی۔ بعد ازاں اس کا کوئی مستقل علاج کیا جاسکتا ہے۔

○ چہرے پر پڑنے والے داغوں سے نجات حاصل کے لیے جائفل کو دودھ میں پیس کر چہرے پر اس کا گاڑھا لیپ کریں۔

○ تازہ پھلوں کا رس چہرے پر ملنے سے چہرہ شاداب ہو جاتا ہے۔

○ ملتانی مٹی، کھیرے کا رس اور شہد کا ماسک بنا کر چہرے پر لگانے سے چہرے کی تروتازگی اور نکھار میں اضافہ ہوتا ہے۔

○ ایک گلاس گرم دودھ میں ہر روز شہد خالص کے دو چمچے ملا کر پینے سے چہرے کی رنگت نکھرتی ہے۔

○ سرسوں اور تل باریک پیس کر دودھ میں شامل کر کے رات کو سونے سے قبل چہرے پر لگائیں۔ چہرے کا رنگ صاف ہو جائے گا۔

○ ناشتے سے قبل ایک گلاس نیم گرم پانی میں لیموں کا رس ملا کر پینے سے رنگت نکھرتی ہے اور چہرے کی شادابی میں اضافہ ہوتا ہے۔

○ چند گرام بیسن میں تھوڑا سا دودھ، چند قطرے لیموں کا رس اور ایک چٹکی ہلدی ملا کر چہرہ دھولیں۔ چند روز کے عمل سے آپ کا چہرہ چمک اٹھے گا۔

○ خربوزے کے بیج چھیل کر پانی میں پیس لیں اور چہرے پر لیپ کریں چہرہ شاداب ہو جائے گا۔

○ آٹے کی بھوسی کو دودھ میں ملا کر کریم بنالیں اور چہرے پر لگائیں، چہرہ کھل اٹھے گا۔

○ چرونجی کو دودھ میں پیس کر ہلکا سا گرم کریں اور رات کو سونے سے قبل چہرے پر اس کی مالش کریں۔ صبح اٹھ کر کسی معیاری صابن سے چہرے کو دھولیں۔ سیاہ رنگت کو نکھارنے کا بہترین نسخہ ہے۔

○ آدھا پاؤ دودھ گرم کر کے اس میں دو عدد لیموؤں کا رس ڈال دیں۔ جب دودھ پھٹ جائے تو اس کا پانی الگ نکال کر کسی برتن یا شیشے کی بوتل میں محفوظ کرلیں اس پانی میں ہم وزن گلاب کا عرق ملا کر چہرے پر لگائیں چہرہ شاداب ہو جائے گا۔

○ دن میں دو مرتبہ تازہ لیموں کے رس سے چہرے کی مالش کرنے اور آدھ گھنٹے بعد کسی اعلیٰ معیار کے صابن سے دھو لینے سے چہرے کی شکنوں سے نجات مل جاتی ہے۔

○ دودھ میں زیتون کا تیل ڈال کر پینے سے چہرے کی رنگت نکھر آتی ہے۔

○ آٹے کی بھوسی کو چھاچھ میں ملا کر دس منٹ کے لیے چہرے اور گردن پر لگائے رکھیں رنگت نکھر آئے گی۔

○ تازہ سنگترے کے چھلکے چند روز سائے میں رکھ کر خشک کرلیں۔ اس کے بعد کسی برتن میں ڈال کر اتنا دودھ ڈالیں کہ چھلکے اچھی طرح بھیگ

جائیں۔ دو گھنٹے بعد انھیں دودھ میں ہی پیس لیں یا گرائنڈ کرلیں، یہ ایک ابٹن بن جائے گا۔ اسے ہر روز رات کو سونے سے پہلے چہرے، گردن اور ہاتھ پیروں پر لگائیں اور صبح کو کسی اچھی صابن سے دھو لیں۔ تین چار روز تک یہ عمل کریں جلد کی رنگت نکھر آئے گی۔

○ انڈے کی زردی اور زیتون کے تیل کا آمیزہ بنا کر چہرے پر لگانے

سے چہرہ نرم و ملائم ہو جاتا ہے۔

○ شکر کے شربت میں لیموں کا رس ڈال کر پینے سے رنگ نکھر جاتا ہے۔

○ اگر چہرے پر گڑھے ہوں تو تھوڑی سی ملتانی مٹی لے کر اس میں عرق گلاب ڈالیں اور آمیزہ بنالیں۔ اس آمیزے کا لیپ چہرے پر کریں۔ اور دس پندرہ منٹ بعد تازہ پانی سے دھولیں۔ گڑھے ختم ہو جائیں گے۔

○ ایسی خواتین جن کے چہرے پر، ماتھے پر ناک کے نیچے بال ہوں انھیں چاہیے کہ ایمونیا اور ہائیڈروجن پر آکسائیڈ کا محلول بنا کر محفوظ کرلیں اور رات کو سونے سے پہلے روئی کے پھائے سے بالوں پر لگائیں۔

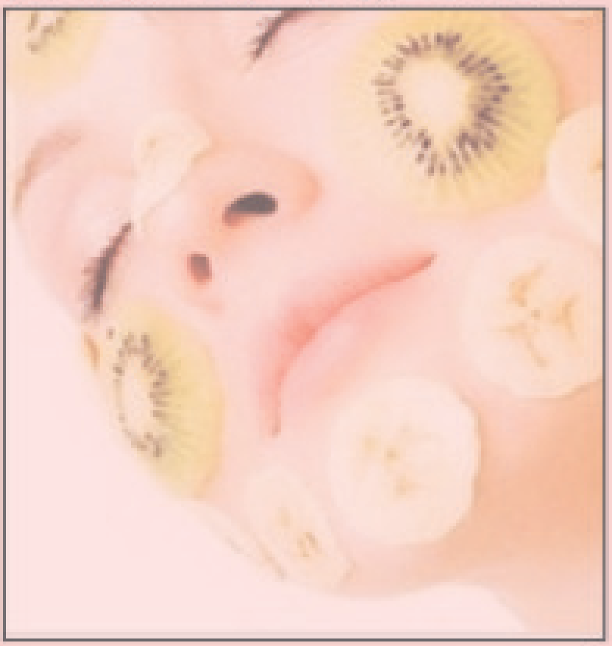

خشک ہونے پر پانی سے دھولیں۔ ان غیر ضروری بالوں سے نجات مل جائے گی۔

○ چہرے کے بالوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے کچے پپیتوں کو اچھی طرح پیس کر بالوں پر لگائیں۔ تھوڑی دیر بعد آرام سے اتارلیں۔ اس طرح بال بالکل ختم ہو جائیں گے۔

○ نہانے کے بعد رخساروں پر لیموں کا عرق مل کر کچھ دیر بعد سرسوں کا تیل لگائیں اور پھر تولئے سے پونچھ لیں۔ آپ کے رخسار گلاب کی طرح نرم و ملائم ہو جائیں گے۔

○ پودینے کی پتیاں ابال کر اس کے پانی کو کھلے منہ کے برتن میں تھوڑی دیر ٹھنڈی جگہ رکھ دیں اور روزانہ صبح سویرے اس کا چوتھائی کپ پی لیں۔ رنگت سرخ و سفید ہو جائے گی۔

○ کڑوے باداموں کو پانی میں رگڑ کر چہرے پر ملنے سے جلد کی رنگت نکھر آتی ہے اور چہرہ چمک اٹھتا ہے۔

○ گاجر کو باریک پیس کر چہرے پر اس کا لیپ کریں۔ کم از کم نصف گھنٹے تک لگا رہنے دیں۔ اس کے بعد ٹھنڈے پانی سے دھولیں۔ آپ کا چہرہ پہلے سے کہیں زیادہ شاداب اور کھلا کھلا نظر آئے گا۔

○ روزانہ نہار منہ ایک گلاس کینو کا رس پینے سے چہرے کی رنگت صاف ہو جاتی ہے۔

○ چہرے کی رنگت مرجھانے کی صورت میں کارن فلور، دودھ اور چند قطرے لیموں کا رس ملا کر آمیزہ بنالیں اور چہرے پر مالش کریں۔

○ مولی کا رس چہرے پر ملنے سے کیل مہاسوں کے نشان دور ہو جاتے ہیں۔

○ ککڑی کے بیجوں کو پیس کر چہرے پر لیپ کرنے سے رنگت نکھرتی ہے۔

○ نیم گرم پانی میں شہد ملا کر روزانہ پینے سے مرجھایا ہوا چہرے کھل اٹھتا ہے۔

○ اگر آپ کے چہرے پر بھورے رنگ کے تل ہوں تو انھیں ہلکا کرنے کے لیے روزانہ کھٹی لسی سے چہرے کو مل مل کر دھوئیں۔ تل ہلکے ہو جائیں گے۔

○ خالص گلیسرین کو عرق گلاب میں ملا کر چہرے پر آرام سے مالش کریں۔ ایک گھنٹے بعد منہ دھولیں۔ ایسا کرنے سے بھورے تلوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔

○ چیچک کے داغوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے خالص پستہ پیس کر سفوف بنالیں۔ رات کو سوتے وقت چیچک کے داغوں پر ملنے۔ چھ ماہ ایسا کرنے سے پہلے داغ مدھم پڑیں گے پھر آہستہ آہستہ ختم ہو جائیں گے۔ صبر و تحمل اور مستقل مزاجی سے استعمال کریں، انشاء اللہ فائدہ ہوگا۔

○ چہرے پر زردی نمایاں ہونے کی صورت میں گاجر کا جوس روزانہ ایک گلاس پئیں اور رات سونے سے پہلے ایک گلاس دودھ پئیں۔ چہرے کی زردی ختم ہو جائے گی۔

○ روزانہ آدھ کلو گاجر پانی میں ابال کر کھانے سے چہرے کی زردی ختم ہو جاتی ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

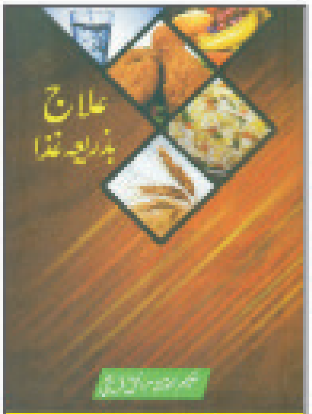

صفحات: 415، قیمت: 185 روپے

صفحات: 496، قیمت: 220 روپے

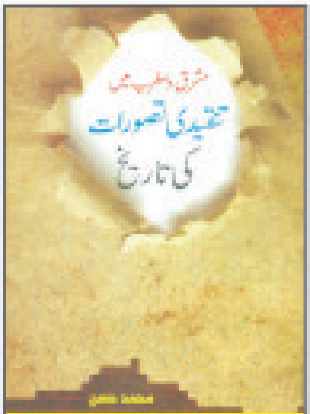

صفحات: 373، قیمت: 168 روپے

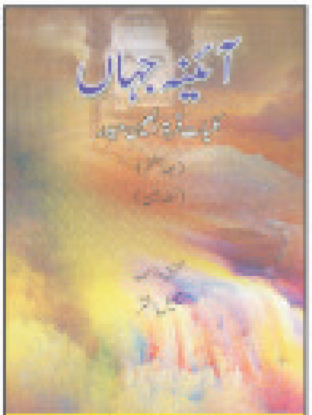

صفحات: 262، قیمت: 130 روپے

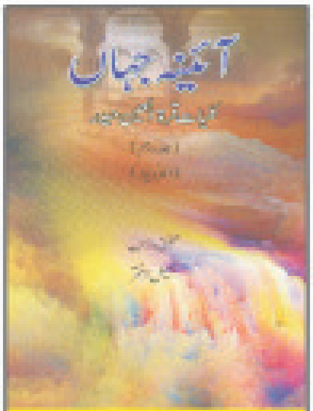

صفحات: 245، قیمت: 128 روپے

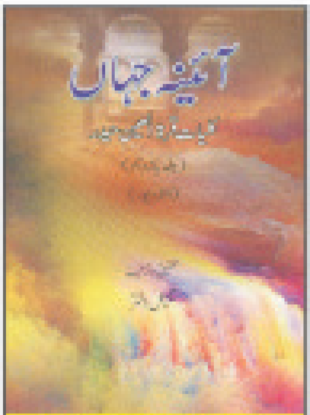

صفحات: 258، قیمت: 132 روپے

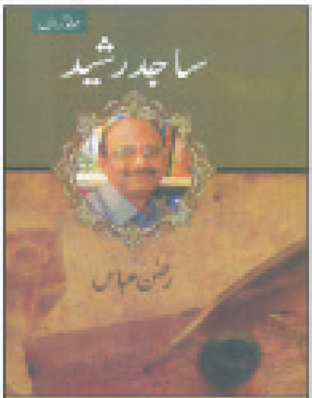

صفحات: 123، قیمت: 77 روپے

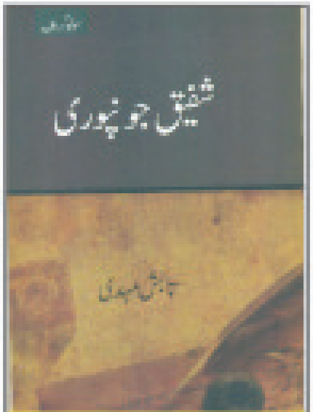

صفحات: 120، قیمت: 73 روپے

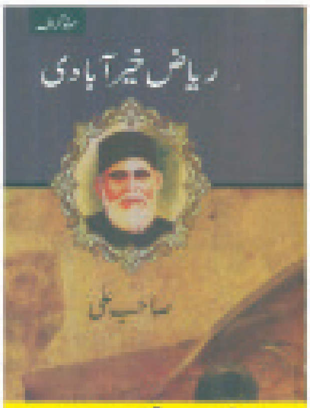

صفحات: 215، قیمت: 75 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159 E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Mahnama Khawateen Duniya , March 2017, Vol. 01, Issue: 1
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

एक भारत श्रेष्ठ भारत

بچوں کے لیے قومی اردو کونسل کی چند دلچسپ کتابیں

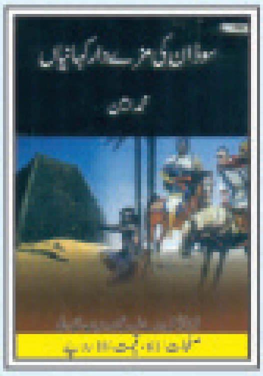
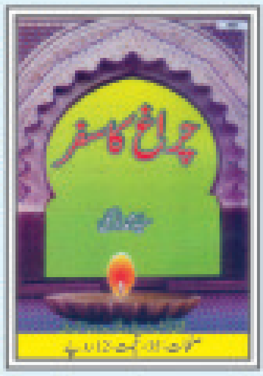

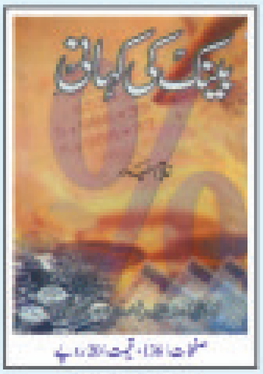

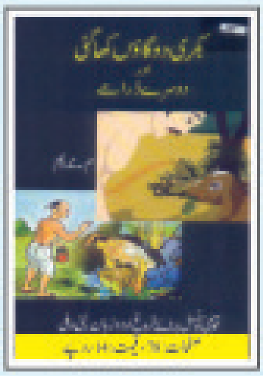
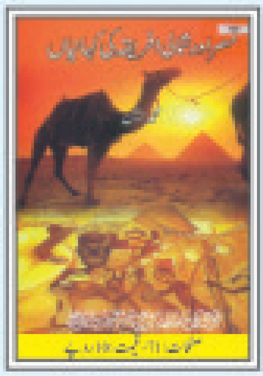
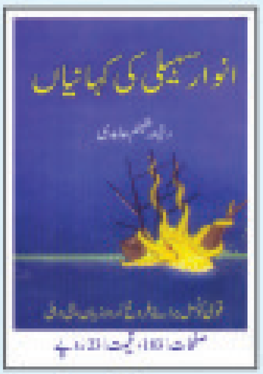

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Prof. Syed Ali Kari, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at Salasar Imaging Systems, C-7/5, Lawrence Road, Industrial Area, New Delhi-110035
And Published at Farogh-e-Urdu Bhawan, FC/9, Institutional Area, Jasola, New Delhi-110025